تیسرے قدم کا خمیازہ

نصیر احمد ناصر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تیسرے قدم کا خمیازہ

تیسرے قدم کا خمیازہ

نثری نظمیں

نصیر احمد ناصر

سانجھ پبلی کیشنز، لاہور

تیسرے قدم کا خمیازہ ـــ شاعری ـــ نصیر احمد ناصر

سانجھ پبلیکیشنز نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، سے چھپوا کر،
46/2 مزنگ روڈ' لاہور' پاکستان' سے شائع کی۔

نام کتاب : تیسرے قدم کا خمیازہ
شاعر : نصیر احمد ناصر
اشاعتِ اوّل: جنوری ۲۰۱۳ء
سرورق : سعید ابراہیم
قیمت : ۳۵۰ روپے

Teesrey qadam ka khamiaza
(Urdu Poetry by Naseer Ahmed Nasir)

Printed by:
Shirket Printing Press, Lahore.

Price:
In Pakistan: Rs. 350.00

Published by:

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593-083-0

سمیر کے لیے

فہرست

نثری نظم کا تخلیقی جواز

نثری نظم کے شجرہ نسب کی جڑیں دنیا کے قدیم ادب سے ملتی ہیں۔ بہت سی دیو مالائیں، لوک داستانیں اور قبل مسیح کے طویل رزمیے اپنے شاعرانہ آہنگ، ہیئت اور اسلوب میں نثری نظم کے قریب تر ہیں۔ قدیم ویدوں اور سنسکرت ادب سے بھی اس کے ڈانڈے ملائے جاتے ہیں۔ مغرب میں نثری نظم کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ ابتداً فرانس میں اور بعدہٗ امریکہ میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ اردو میں مختلف ہیئتوں اور ناموں سے نثری نظم کی مثالیں بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ملنا شروع ہو جاتی ہیں، تاہم ایک ادبی تحریک کے طور پر اس کا باقاعدہ آغاز ساٹھ کی دہائی سے ہوا۔ لیکن لگ بھگ تین دہائیوں تک نثری شاعری کا یہ تجربہ اردو شعریات میں کسی واضح قبولیت کے مقام تک نہ پہنچ سکا اور ماسوا چند تخلیق کاروں کی ذاتی کاوشوں کے نثری نظم کا ''دورِ اول'' بالعموم کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ غالباً سکہ بند قسم کی ادبی تحریکوں کے خلاف ردِعمل اور اردو کی شعری روایات سے یک دم اور یکسر بغاوت تھی۔ اس کے علاوہ اُس دور کے نثری نظم نگاروں کی ضرورت سے زیادہ جدّت و تجرد پسندی اور شعری کیفیات و تجربات کو داخلی صاف گری کے عمل سے گزارے بغیر خام شکل میں پیش کر دینے والا تلخ رویہ بھی اس صنف کی ابتدائی ناکامی کا سبب بنا۔ یہ بات اردو قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو گی کہ نثری شاعری، جس کا آغاز انیسویں صدی کے اوائل میں

فرانس سے ہوا اور صدی کے آخر تک دیگر مغربی ممالک میں، وہاں بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی تک آتے آتے اس کا دم خم ٹوٹ چکا تھا تاوقتیکہ نمایاں امریکی شاعروں نے اسے نئی زندگی دی اور اسے دنیا بھر میں قبولیت ملی، جبکہ اردو میں عین اُس وقت اِس کا باقاعدہ آغاز ہو رہا تھا۔ اوکتاویو پاز نے اس فارم کو ہسپانوی زبان میں استعمال کیا۔ روس اور جاپان میں بھی اس صنف میں خاصا کام ہوا۔ اینے ماریا رلکے، فرانز کافکا، جارج لوئیس بورخیس، پابلو نرودا، اوکتاویو پاز، ولیم کارلوس ولیم، ان سب نامور لکھاریوں نے نثری شاعری کی فارم کو نہ صرف اپنایا بلکہ اپنے اپنے انداز میں اس کی توضیح وتوصیف کی اور اس کی ہیئت اور ڈکشن میں خاطر خواہ اضافے کیے۔ اُسی (۸۰) کی دہائی کے آخر سے دنیا بھر میں، بشمول اردو، اس صنف ادب کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور اب یہ بڑی حد تک ردوقبول کے مرحلے سے آگے نکل آئی ہے۔ امریکہ میں تو نثری نظم کو یہاں تک فروغ حاصل ہے کہ بعض یونیورسٹیوں میں ادب کے طلبا کو رائم (Rhyme) لکھنے سے منع کیا جاتا ہے۔

گزشتہ پچیس تیس برسوں سے اردو نثری نظم ایک نئے فنامنا سے گزر رہی ہے۔ اُسے نثری نظم کا ''دورِ ثانی'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ اِس بار میدانِ قرطاس میں زیادہ تر وہ شعراء ہیں جو جدید تر شعری حسیات اور عصری ادبی شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ اردو کی کلاسیکی شعری روایات سے بھی مربوط ومنسلک ہیں اور فنِ شعر گوئی یعنی اوزان و بحور پر بھی گرفت رکھتے ہیں۔ نثری نظم نگاروں کی اس کھیپ کی شعری ترجیحات وترغیبات کسی خاص ادبی تحریک کے تابع یا خلاف نہیں بلکہ ادب کے اُن جدید اور پس جدید متنوع تخلیقی رویوں سے عبارت ہیں جو اس صنف میں نت نئے اسالیب اور موضوعات کے اضافے کا باعث ہیں۔ بلاشبہ اس زمرے میں وہ شعراء اور نارسیدہ و ناپختہ کار خامہ فرسا شامل نہیں کیے جا سکتے جو اردو کی شعری وعروضی روایات سے آگاہی حاصل کیے بغیر اُلٹی

سیدھی سطروں میں سطحی اور خام شعری مواد کو نثری نظم یا نظم کے نام سے پیش کر دیتے ہیں۔

احساسات و خیالات کے بہاؤ کو شعوری طور پر کسی مخصوص سانچے میں ڈھالنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسا کرنے سے تخلیقی خوبصورتی، بے ساختگی اور نظم میں بین السطور بہنے والی اداسی اور آ گہی کی رَو متاثر ہوتی ہے۔ دراصل ہر نظم اپنی ہیئت یا ساخت خود لے کر آتی ہے۔ تخلیق کے بعد اس کی تراش خراش تو کی جا سکتی ہے، لیکن تخلیقی عمل کے دوران اسے زبردستی ''نظم'' یا ''نثری نظم'' نہیں بنایا جا سکتا۔ نثری نظم کہنا ایسا آسان بھی نہیں جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں اور نہ نثری نظم کے نام پر شائع ہونے والی چھوٹی بڑی چند سطروں پر مشتمل ہر تخلیق کو نثری نظم کہا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے گہرے تہذیبی شعور، آ گہی، عرفانِ ذات، جدید طرزِ احساس، عمیق مطالعے و مشاہدے، مزاج کی موزونیت اور علامتوں، استعاروں، تشبیہوں اور پیکروں کے پیچیدہ مگر قابلِ فہم نظام کے علاوہ شعری عناصر، نامیاتی وحدت اور پسِ الفاظ و بین السطور ایک اندرونی آہنگ جیسے لوازمات کا ہونا ضروری ہے۔

اردو نثری نظم پر اب تک بے شمار مباحثے و مکالمے ہو چکے ہیں اور طویل مضامین رقم کیے گئے ہیں۔ جن میں اس کے نام، پس منظر، مزاج، آہنگ، علامتی و استعارتی نظام، فنی و فکری جواز اور شناخت پر تفصیل دار بحث کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک اہم سوال اپنی جگہ برقرار ہے کہ بعض شعراء اظہار کے مختلف سانچوں مثلاً غزل، پابند نظم، معریٰ نظم، آزاد نظم اور دیگر اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے ہوئے بھی نثری نظم کب اور کیوں کہتے ہیں؟ دراصل نثری نظم اُس وقت سرزد ہوتی ہے جب تخلیقی اداسی اور آ گہی انسانی بس سے باہر ہو کر وجود کی حدیں پار کرنے لگتی ہے اور شاعری کے مروج سانچے یا پیمانے اس کے اظہار کے لیے ناکافی ہو جاتے ہیں۔ شاید انسان کی ازلی و ابدی تنہائی اور فکری اپج کسی

ایسے شعری نظام اور لسانی آہنگ کی متقاضی ہے جسے ابھی تک دریافت نہیں کیا جا سکا یا
جسے ابھی تک کوئی نام نہیں دیا جا سکا۔ شاید نثری نظم اظہار کی اسی بے بسی کا غیر مرئی تخلیقی
جواز ہے۔

نثری نظم کو پاک و ہند کے مختلف ادبی مکاتبِ فکر نثری نظم، نثرِ لطیف، نثرین، نثر
پارے، نثرانے، نثم، نثمانے، نظم کہانی، نظمیے، امکانات، نظمِ نو، غیر عروضی نظم وغیرہ کے نام
سے قبول کرتے اور اپنے اپنے رسائل میں شائع کرتے ہیں۔ بیشتر اسے ''نثری نظم'' کے
نام سے الگ شائع کرتے ہیں یا نظم کے خانے ہی میں رکھتے ہیں۔ گویا اس صنف میں
اظہار پر تو کوئی اعتراض نہیں لیکن اس کے نام کا مسئلہ درپیش ہے۔ کچھ مکاتبِ فکر ایسے
بھی ہیں جو اپنے افکار و نظریات میں جامد یا بہت زیادہ قدامت پسند ہونے کے باعث
اس صنف کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ رویہ بھی ادبی اعتبار سے قابلِ تحسین
نہیں۔ تاہم یہ احتیاط برحق ہے کہ نئی نسل کی شعری تربیت اور نصابی ضرورت کے تحت
نثری نظم کو معریٰ اور آزاد نظم سے الگ رکھا جائے۔

شعر و ادب کا ماخذ چاہے کسی بھی زبان سے نسبت رکھتا ہو، حتمی تخلیقی معیار کی قدر
تعین کے لیے اسے بالآخر اسی زبان کے حوالے سے دیکھا اور پرکھا جانا چاہیے جس میں
وہ تخلیق کیا گیا ہو۔ چنانچہ اردو نثری نظم کو بھی سنسکرت، ہندی، فرانسیسی اور انگریزی زبان و
ادب اور ماخذات کی کسوٹی پر پرکھنے کے بجائے، اردو زبان کی کٹھالی میں پگھلا کر، اسے
اپنے سانچوں میں ڈھال کر دیکھنا ضروری ہے۔ اردو نثری نظم ساٹھ اور ستر کی دہائیوں پہ
مشتمل اپنے عبوری دورانیے (دورِ اوّل) سے گزر کر اب اس مقام پر ہے جہاں اس کے
''ماخذات'' اور اس میں ''اوّلیت'' جیسے نزاعی معاملات ضمنی نوعیت کے رہ جاتے ہیں اور
''تخلیقیت'' زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ بالخصوص بیسوی صدی کی آخری دہائی اور اس کے
بعد میں تخلیق ہونے والی اردو نثری نظم اپنی ہیئت، اسلوب، موضوعات، زبان و بیان،

لفظیات، کثیر معنویت، حساسیت، شعریت اور عصر آفرینی کے اعتبار سے ارتقا اور خود انحصاری کی روشن دلیل ہے۔ جو لوگ اسے کلیتہً رد کرتے ہیں وہ دراصل اپنی شعری وادبی نارسائی کا اظہار کرتے ہیں۔ یقیناً دیگر اصنافِ ادب کی طرح اس میں بھی رطب و یابس اور ناشاعری در آئی ہے لیکن اہل نقد و نظر کو چاہیے کہ وہ ژرف نگاہی سے کام لیتے ہوئے اس کی چھان پھٹک کریں اور اس کی صحیح شعریات ترتیب دیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وسیع تر تخلیقی امکانات کی حامل اس صنفِ سخن پر کوئی سنجیدہ اور متفقہ لائحہ عمل اختیار کیا جائے، اس کی ارتقائی پیش رفت کو تسلیم کرتے ہوئے برسوں پہلے کے عبوری خیالات و نظریات پر نظرِ ثانی کی جائے اور اسے برزخ کے عالم سے نکالا جائے۔

نصیر احمد ناصر

(اداریہ، تسطیر، جنوری ۱۹۹۸ء، بہ ترمیم)

نثری نظمیں

(۱۹۷۵ء تا ۲۰۱۲ء)

رات زندگی سے قدیم ہے

یہ سچ کی وہی فصل ہے
جو مٹی کی نمو سے اُٹھی
اور آسمان تک پھیل گئی
تب ہم بہت دور تک چلے تھے
اور بہت دیر تک جاگتے رہے تھے
اور باتوں کے بے انت سلسلے
ہمارے درمیان بچھی مسافت سے طویل تھے
اور جب ہم نے پاؤں اُٹھانا سیکھ لیا
تو ہمیں دھکیل دیا گیا
ابدیت کے بے آغاز راستوں کی طرف

اور تم نہیں جانتے تھے
کہ رات زندگی سے قدیم ہے
اور تمہاری ہری بھری شاداب فصلیں
میری روح کو غذا
اور بدن کو روشنی فراہم نہیں کر سکتیں
تم نے بارہا مجھے پکارا
اور میں خاموش رہا
کہ خاموشی میں عافیت تھی
سروں اور ہاتھوں کی فصلیں کاٹنے والے
قلم کی تراش
اور موقلم کی خراش سے نابلد ہوتے ہیں
مٹی راستہ بننے سے پہلے
رنگوں کا بلیدان مانگتی ہے
لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے
ریوڑ ہانکتے ہوئے
دانش اپنے آپ میں تنہا ہوتی ہے
تنہا اور بے امان ....
مَیں ان کھیتوں میں بارہا بویا اور کاٹا گیا ہوں
مَیں دھرتی کا بیج ہوں
یا کائنات کا دل،

تمہاری آواز
مجھے نمو کے سفر پر اُکساتی رہے گی
اور پھر ایک دن ہم
اُتر جائیں گے
اُن دریاؤں کے پار
جہاں راستے ہیں نہ مسافر
دُھوپ ہے نہ شام
بس ایک خواب جیسی دُھند ہے
اور پہاڑ جیسی رات
جس کے آخری سرے پر
(اور رات کا آخری سرا ہوتا ہی کب ہے)
ایک کچی دیوار پر پوتا ہوا وقت ہے
اور کوسوں دُور
کئی راستوں کو رگیدتی ہوئی
ایک سڑک ہے
طویل اور بے نشان ....
کیا ہم اپنے قدموں سے بنائے ہوئے راستوں
اور اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے
درختوں کو بھول سکتے ہیں!!

شجر آباد

نظم خلا میں نہیں لکھی جاتی
نظم کے درخت کا
محورِ کاذب زمین پر ہوتا ہے
اور جڑیں پاتال میں
شاخیں شاعر کے دل میں،
پھول اور پھل
آسمان کی چھت پر
اور سایہ......
نظم کے درخت کا سایہ نہیں ہوتا!

پانچواں مفرد

خواب آنکھوں سے شروع ہو کر
پیروں کے تلووں پر ختم ہو جاتے ہیں
دریا پر پُل ابھی نہیں بنا
اور مٹی کو راستہ بننے میں
کئی صدیوں کا سفر درکار ہے
پانی اور ہوا کے ساتھ چلتے ہوئے
وقت مجھ سے آگے نکل جاتا ہے
اور مَیں ...... اِس زمین کا تنہا مسافر
تم سے بہت پیچھے
بچی کھچی عمر کا توشہ سنبھالے

پھیلاؤ کی آخری حد سے
کائنات کے سمٹنے کا انتظار کرتا ہوں
رات کا سایہ دیئے کی لَو سے ڈر جاتا ہے
آسمان کا خیمہ بہت چھوٹا ہے
اور روشنی میرے دِل سے کہیں زیادہ
لیکن فاصلوں کے مدار
خوابوں کے دائروں سے بڑے نہیں ہوتے
الو ہی موسموں میں
جب ستاروں کے پھول کھِل رہے ہوں گے
اور سورج کی آگ پر تتلیاں منڈلائیں گی
تو تمہارے چہرے کا چاند
شامِ ابد کی شاخوں سے طلوع ہوگا
اگر تُم میں انتظار کی شکتی ہوئی
تو مَیں عناصر کی نئی ترتیب کے ہمراہ
تمہیں ملنے آؤں گا!!

خواب اور محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی

ہمیں خبر ہے
کہ ہمارے درمیان بے خبری کی دُھند پھیلی ہوئی ہے
تلاش کے راستے پر چلتے ہوئے
ہمارے قدم اپنی منزل نہیں دیکھ پاتے
تمہارا اندر میری نظموں سے زیادہ خوبصورت اور اُجلا ہے
مگر میری عینک کے شیشے روز بروز دبیز ہوتے جا رہے ہیں
پتہ ہے ہمیں لکھتے ہوئے
نظمیں اور کہانیاں بے لفظ کیوں ہو جاتی ہیں؟
وہ ہماری جائے پیدائش، تاریخ اور عمر جاننا چاہتے ہیں
انھیں کیا معلوم

کہ خواب نہ پیدا ہوتے ہیں نہ مرتے ہیں
ان کا اندراج کسی رجسٹر میں نہیں ہوتا
مَیں نہیں جانتا
تم نے کب خواب کی انگلی تھامے ہوئے
نیند میں چلنا سیکھا
لیکن مَیں وہ خواب ہوں
جسے آج تک کسی نے نہیں دیکھا
مَیں تو اُس روز ہی مر گیا تھا
جس روز باپ نے ماں کے حاملہ پیٹ پر ٹھوکر لگائی تھی
مگر میں قبر کے اندر بڑا ہوتا گیا
اتنا بڑا کہ ماں مجھے سر جھکائے بغیر دیکھ سکتی ہے
ایک بار کسی کی تصویر کھینچتے ہوئے
کیمرہ میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا
تب مجھے پتہ چلا
کہ خواب روشنی میں سیاہ کیوں ہو جاتے ہیں
انھیں ایکسپوز کرنے کے لیے اندھیرے کا محلول کیوں ضروری ہے
روشنی تاریکی ہی میں نظر آتی ہے
ہم وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہیں
ہماری جگہ کوئی اور ہوتا ہے
ہمارا کاسٹیوم پہنے ہوئے

بہتے پانی کی کوئی شکل نہیں ہوتی
شکلیں ہماری آنکھ میں ہوتی ہیں
خواب دیکھنے کے لیے
نیندوں کی نہیں آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے
پروٹوزون (Protozoan) سے منش تک
کئی ملین سالوں کی ارتقائی نیند
محض آنکھیں کھولنے کا عرصہ ہے
موت اور زندگی میں محبت کا فاصلہ ہے
جسے ناپنے کے لیے ہم عمر کا پیمانہ استعمال کرتے ہیں
اور جینے کا ڈھونگ رچاتے ہیں
لیکن محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی
یہ تو ایک نامعلوم انت سے
دوسرے نامعلوم انت تک موجود ہے
ہم جہاں سے اسے دریافت کرتے ہیں
وہیں پر اپنی اپنی حد مقرر کر لیتے ہیں
اور اسے رشتوں اور ناموں میں تقسیم کر دیتے ہیں
اُداسی ہمارے علم اور تجربے سے کہیں زیادہ ہے
اِسے پھیلنے دو!
رنگوں، پھولوں اور تتلیوں کو
لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا

پرندوں، پودوں اور اچھے لوگوں سے باتیں کرنے کے لیے
خاموشی سے بہتر کوئی اظہار نہیں
کوئی بات اپنی عمر سے بڑی نہیں ہوتی
کیا خبر ہم کسی عظیم خواب کی بیداری میں ہوں
اور کوئی ہمیں کائناتی آنکھ سے دیکھ رہا ہو
پرم آتما کو خواب دیکھتے ہوئے ڈسٹرب مت کرو!!

ایک تصویر زا نظم کا اسپکٹروگرام

دیواریں دروازوں سے باہر نکل آئی ہیں
راستے تنگ ہیں
اور قدموں کے نشان زیادہ
نیم دراز دھوپ کی ڈھلوانوں پر
اپنے ہی سایوں کو پھلانگتے ہوئے
منہ کے بل گر پڑنا
عین سچائی ہے انوکھا پن نہیں
کسی دیرینہ خواب کو دیکھتے ہوئے
آنکھوں کو پتہ ہی نہیں چلتا
کہ ان کے سمندروں سے کتنا پانی نکل چکا ہے

دریا عبور کرنا آسان ہے
لیکن کنارے پر پاؤں رکھنا بہت مشکل
بستیوں کے نواح سے گزرتے ہوئے
تاریخ کے راستے
کھیتوں، چراگاہوں
انگوں کے باغوں
اور عورتوں کے نشیب و فراز میں غائب ہو جاتے ہیں
نئی فصلیں تیار ہونے تک
موسم ملتوی ہوتے رہتے ہیں
فلسفے چند لوگوں کے لیے ہیں
اور موت سب کے لیے

کوئی نظم نہ لکھ سکنا
شاعر کا المیہ نہیں ہوتا
زندگی مرگِ مسلسل سے دوچار ہو
تو موت ایک گھسا پٹا لفظ بن کر رہ جاتی ہے
متروک دنوں کی آبیاری سے
بے دِلی کی مشقت کے سوا کچھ نہیں اُگتا
اس سے پہلے کہ ہم حالتِ تنہائی میں
کسی نادیدہ ستارے سے دیکھ لیے جائیں
آؤ، ان کہنہ عمارتوں کے صدر دروازوں سے گزریں

جن پہ استادہ غلام روحیں
گردوغبار سے اٹے جسموں
اور بھربھری ہڈیوں میں تبدیل ہو چکی ہیں
اور ہاتھ کے ایک اشارے سے
اپنے ہی قدموں میں گر پڑیں گی
بادلوں کے پنچھی
اور بارشوں کا دھواں
موسمیاتی سیارے کی دسترس سے اب زیادہ دور نہیں !!

عدالت کو کیا معلوم!

یہاں زندہ رہنے کی خواہش ایسی ہے
جیسی بے پر کی تتلی
اور موت کا پروانہ لینے کے لیے بھی
عدالت میں جانا پڑتا ہے
جو اپنے فیصلے کی بنیاد
گواہوں کے بیانات پر رکھتی ہے
عدالت کو کیا معلوم
کہ خدا دُکھی لوگوں کی گواہی دینے
کبھی کبھی خود کٹہرے میں آ جاتا ہے!

مفرور

دیکھو، میرے دل میں راستے تلاش مت کرو!
تمھیں کیا معلوم
کہ میں کتنی دُور سے چل کر آیا ہوں
اور ابھی کتنی دُور جانا ہے
زمین چاروں طرف سے رات کے خلا میں ڈوبی ہوئی ہے
اور وہ ایک اِک ستارے میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں
تمہاری پناہ گاہ کی روشنی
اُنھیں اِس طرف کھینچ لائے گی
اور مجھے کیموفلاژ کرنے کی پاداش میں
وہ تمہاری آتما نذرِ آتش کر دیں گے

اور گوشت مالِ غنیمت کی طرح بانٹ لیں گے
مَیں ایک بار پھر قیدِ دوام میں ڈال دیا جاؤں گا
دیکھو، وقت کم ہے
آنکھیں صدیوں تک خوابوں کی متحمل نہیں ہو سکتیں
جسم سرحدیں پار کرتے ہوئے
خار دار تاروں میں اُلجھ جاتے ہیں
اور ہاتھ تارِ عنکبوت کی طرح
کھڑکیوں کے شیشوں سے چپکے رہ جاتے ہیں
سُنو، ہوا کے کان سرگوشیوں سے بھرے ہوئے ہیں
اور وہ آتشیں ہتھیاروں کے ساتھ
جنگلوں اور پہاڑوں کو فتح کرتے ہوئے
خشکی کے آخری سرے تک آ پہنچے ہیں
اِس سے پہلے کہ سمندر اُن کی دسترس میں آ جائیں
مجھے نکل جانے دو
اُن جزیروں کی طرف
جہاں کبھی وحشی قبائل آباد تھے
مگر اب تیل تلاش کرنے والے اداروں کی رہائش گاہیں ہیں
وہاں پام کے گھنے درخت
طلوعِ آفتاب تک مجھے چھپائے رکھیں گے......!!

ڈیمارکیشن (DEMARCATION)

وہ ہمیں ملنے آتے ہیں
ہواؤں اور بارشوں کے ساتھ
دروازوں کے پاس
اُن کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں
اور خالی برآمدے
کپڑوں کی سرسراہٹ
اور جسموں کی مہک سے بھر جاتے ہیں
دیواریں اُلانگتے، چھتوں اور چھجوں سے پھسلتے
بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے
بادلوں کے سایوں کی طرح

نیم پختہ دالانوں کے سناٹے میں
آنکھیں انھیں دیکھتی ہیں
دسترس سے دُور
طویل فاصلوں کی طرف جاتے ہوئے!

کھڑکیاں منہ کھولے ہوئے
اونگھتی ہیں
اور سوچتی ہیں
کہ زمین کو پچھاڑ کر
اس کے سینے پر بیٹھے
فتح مندی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے
ان پہاڑوں سے پرے بھی
کوئی جھیل ہوگی
اور پرندے
اور سفید بادل
اور ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہوئے
گھنے درختوں کے جھنڈ
ناہموار گھاس کے میدان
ریوڑ اور تنہا گڈریے
اور دُور جاتے ہوئے راستے ہوں گے

کوئی گاؤں، کوئی شہر ہوگا
یا پھر کوئی دوسرا ملک
جہاں کوئی شاعر (میری طرح) بیٹھا
نظمیں لکھ رہا ہوگا!

کاغذوں پر حدیں باندھنا آسان ہے
چند نقطوں اور لکیروں سے
پہاڑ، ندیاں، نالے، نشیب
کھیت، بستیاں، علاقے، عملداریاں
درّے اور خفیہ راستے
یہاں تک کہ قلعے اور فصلیں
اور فصیلوں پر
آہنی سروں کی قطاریں بن جاتی ہیں
مگر دیواریں اُلانگتے سایوں
دروازوں، کھڑکیوں، دالانوں
اور دِلوں کے دور دراز منطقوں تک پھیلے
سناٹوں کی نشاندہی کرتے ہوئے
زمین کے نقشے پر
دھوپ اور بارش کا رنگ بدل جاتا ہے!!

نظمیہ

اچانک کسی موڑ پر
تاریخ رک جاتی ہے
لیکن نظم چلتی رہتی ہے
ایک انت دھارا میں!

میں نے شاعری کی انتہا دیکھ لی تھی!

نانا جی کے ساتھ
کھیتوں میں کام کرتے ہوئے
برساتی ندی کے پار بیلے میں
بکریاں چَراتے ہوئے
مکو کی جھاڑیوں کو چھیڑتے ہوئے
اور کیکر کی چھاؤں میں بیٹھ کر
اچار کے ساتھ روٹی کی سرشاری میں
نشیبی نالے سے پانی پیتے ہوئے
میں نے دیکھا شاعری کو
انتہا پر، اپنے اصلی روپ میں

ابتدا کا تو معلوم نہیں

تب پتا تھا نہ اب

لیکن انتہا کو پہلے دیکھ لینا

عینک کے بغیر

حقیقت کی بے لباسی میں، سر تا پا برہنہ

زندگی اور موت کے باہم آمیز نشے سے کم نہ تھا

نانا جی کی باتوں سے

میں نے خاموشی سیکھی

اور خدا کی نظمائی ہوئی فطرت سے

آسمانی گیتوں کی بازگشتیں

جو زمین کی سب سے نچلی تہوں سے پھوٹ رہی تھیں

ابھی کسی ارسطو

اور کسی نیرودا کا

میرے اندر ظہور نہیں ہوا تھا

فقط نانا جی تھے

اور میں تھا

اور اونچے نیچے کھیت تھے

اور ہوا تھی

اور بادل تھے

اور اچانک امنڈ آنے والی بارش تھی

اوران سب کے درمیان
خوامخواہ پھیلی ہوئی
ایک اَن مَنی سی تنہائی تھی
جو تب سے اب تک
اُسی ایک پوز میں ٹھہری ہوئی ہے
جس پوز میں
اسے کائناتی فریم کے اندر چپکایا گیا تھا
بس ہمارے منظر نامے بدل گئے ہیں
نانا جی ہیشگی کی نیند سو چکے ہیں
اور میں ہموار ہوتی ہوئی آبائی قبروں سے دُور
اپنے نواسے کی انگلی پکڑ کر
قریبی پارک میں
اسی کی طرح چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگ رہا ہوں
اور شاعری
کسی پلے لینڈ میں کبھی نہ رکنے والا جھولا جھول رہی ہے!

اداسی اور دکھ میں خفیف سا فرق ہے

ساحلوں پر رہ جانے والی
اُداسی عظیم ہے
اور سمندروں میں اترنے والے دکھ
عظیم تر!

دُکھ

دُکھ کسی بچے کی بنائی ہوئی تصویر ہے
زندگی کے ٹریسنگ پیپر پر
دُکھ کبھی سیدھی، کبھی آڑی ترچھی
لکیریں بناتا ہے
کبھی مخروطی، کبھی چوکور
کبھی اسپائرل
کبھی دائروں میں پھیلتا ہوا
اپنے ہی بے انت میں گُم ہو جاتا ہے
کچھ لوگ سمجھتے ہیں
کہ محبت دُکھ کو جنم دیتی ہے

لیکن محبت تو وہاں سے شروع ہوتی ہے
جہاں دُکھ کی انتہا
پتا نہیں دُکھ چھوٹا ہے یا محبت بڑی
میں تو اتنا جانتا ہوں
کتنا بے مایہ ہے وہ شخص
جس کے پاس ایک عورت کی محبت بھی نہ ہو
حالانکہ دُکھ عورت ہے نہ محبت
دُکھ تو ان دونوں کو
بیک سمے ملاتا اور جدا کرتا ہے
جس طرح وقت ازل اور ابد کو
تو کیا دُکھ ایک مثلث ہے
یا دو سطروں کے بیچ
بے راس دُوری کی ہمیشگی ......؟

محبت کی جنم کوِتا

اے دُکھ کی انتہائی سرحدوں پر کھڑی ہو کر
خالی آسمان اور تنہا ستارہ دیکھنے والی عورت تو!
کبھی تم نے خواب میں روتے ہوئے مرد کا چہرہ دیکھا ہے؟
دُکھ آنسو نہیں کہ بہایا جا سکے
قطرہ بھر نیر بہانے سے سپت ساگر شانت نہیں ہوتے
آنکھیں عمر بھر روتی ہیں
مگر آنسو نہیں بن سکتیں!
امرت کے لیے دودھ کا سمندر بلونا آسان ہے
لیکن زہر پینا بہت ہی مشکل!
دو قدموں کے فاصلے پر کائنات ختم ہو جاتی ہے

تیسرے قدم کا خمیازہ پاتال کا اندھیرا ہے
سات جنموں کے بعد مہا جنم شروع ہوتا ہے
لیکن بن مانگی محبت زندگی میں ایک ہی بار ملتی ہے
اسے سویکار کیے بغیر
اناورتی نہیں ملتی
چھوڑے ہوئے راستوں اور گزری ہوئی ستابدیوں پر
وقت بھی اپنے پاؤں رکھتے ہوئے ڈرتا ہے
گوتم بھی سات قدم اُٹھانے کے بعد رُک گیا تھا
تلاش کے عظیم سفر میں
انت فاصلوں کے بیچ
کوئی انتر دشا نہیں ہوتی
محبت کی لکیر ہاتھ پر نہیں دل پر بنتی ہے
اسے جوتشی کی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا!

تاریخ کا جنما نتر

(۱)

تم مجھے کہاں رکھو گی؟

دل میں، آنکھوں میں

دھنک رنگ ہونٹوں کی نیم وا قوسوں میں

دودھیا پھولوں سے بھری گھاٹیوں میں

آدھی ادھوری نظموں میں

یا کسی بے نام کہانی کے لفظوں میں؟

میں تمہاری نیندوں کی

گزرگاہوں میں جاگتا ہوا

صدیوں پرانا اَن دیکھا خواب ہوں

خواب ہمیشہ صدیوں پرانے ہی ہوتے ہیں
ہم گزرے زمانوں میں ملتے ہیں
یا آنے والے وقتوں میں
حال، جس میں ہم زندہ ہیں
محض ایک قوسی پُل ہے
دو انتہاؤں کو ملاتا اور جدا کرتا ہوا
جسے کراس کرتے ہوئے
ہم چلنا بھول جاتے ہیں
خواب لکھنے اور پوسٹ کرنے کا
کوئی سمے نہیں ہوتا
میں ہر عہد میں تمہاری راہ دیکھتا رہا ہوں
وقت کا ڈاکیا روز گزرتا ہے
کسی یگ، کسی جنم، کسی عمر، کسی صدی میں
تم جب بھی خود کو پوسٹ کرو گی
میں تمہیں وصول کر لوں گا
جنم دن کے تحفے کی طرح
لیکن تاریخ اور محبت کا کوئی جنم دن نہیں ہوتا
یہ تو خود دنوں کو جنم دیتی ہیں!
(۲)
کسی ہمدمِ دیرینہ سے ملاقات کی طلب

مہرباں لفظوں کو چھونے کی خواہش
کیا خواب میں دم گھٹنے کی اذیت سے بہتر نہیں؟
رونا ہی برحق ہے
تو پھر آؤ!
مل کر ایک ہی بار رو لیں
سارے جنموں کا رونا
اپنے منزّہ و مقدّس آنسوؤں کی شبنم
میری پلکوں پر گرنے دو
مجھے اپنی آنکھوں سے رونے دو
کائنات بھی ایک آنسو ہے
خدا کی آنکھ سے ٹپکا ہوا
مجھے اجازت دو
میں تمہارا ہاتھ تھامے ہوئے
پُل صراط سے گزرنا چاہتا ہوں
مرنے سے پہلے مر کر
خدا کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا ہوں
تم میرے اندر کا صحرا نہیں پاٹ سکتیں
میں تمہاری آنکھوں کا جنگل عبور نہیں کر سکتا
میرا سفر اتنا طویل مت کرو
کہ میں تمہارے پاس بھی رکنا بھول جاؤں

مجھے ٹھہرنے کا اذن دو!

(۳)

ہم لاعلمی کی چادر اوڑھے
علم کے جوتے پہنے چل رہے ہیں
تم جانتی ہو
درد کی ڈوری کا آخری سرا کہاں گم ہوا ہے
مجھے معلوم ہے
اسے کہاں سے تلاشنا ہے
اس گنجلتا میں
کون کہاں اُلجھا ہے
ہم کو پتہ ہے
لیکن پاؤں کے جوتے تنگ ہو جاتے ہیں
ڈرائنگ روم میں بچھے راستے طے کرنے میں
عمریں کم پڑ جاتی ہیں
خود سے لپٹ کر بیٹھے
ہم اپنی اپنی اصل کو دُور سے دیکھتے رہتے ہیں
محبت اور دانش میں
ایک ادھوری نظم کا فاصلہ حائل رہتا ہے!

(۴)

گزرے وقتوں میں

فرمانِ شاہی سے
لوگ اپنا قبیلہ، حسب نسب بدل سکتے تھے
مجھے حکم دو
کہ میں اپنے جسم کا چوغہ بدل کر
تمہاری روح، تمہاری اصل میں شامل ہو جاؤں
مجھے ہجر میں پروانۂ وصل دو
تاکہ جب کبھی میرا یہ متروک بدن
ناکردہ وفاؤں کی پاداش میں قتل کیا جائے
تو میں تمہاری محبت کا فرمان دکھا کر
اپنی اصل کی امان پاؤں
اور تم خود پر رونے سے بچ سکو......!!

نئے گوتم کا اُپدیش

دُکھ ڈائری میں نہیں لکھا جا سکتا
نہ کسی نظم میں ڈھالا جا سکتا ہے
نروان کے فاقوں سے بھی
شانتی نہیں مِل سکتی
تاریخ تھک کر ٹھہر گئی ہے
اور دنیا
''نیو ورلڈ آرڈر'' کے تابع ہو چکی ہے
نجات کے لیے
ہمیں پھر سے
ایک طویل خواب ترتیب دینا ہو گا!!

اگر مجھے مرنا پڑا

اگر مجھے مرنا پڑا
تو میں مرنے سے انکار نہیں کروں گا
لیکن کوک کا ایک گلاس پینے کی مہلت طلب کروں گا
یہ جانتے ہوئے بھی
کہ اس کی رائلٹی یہودیوں کو جائے گی
کیونکہ میں تخمیری مشروب نہیں پیتا
چاہے وہ کسی مسلمان کے ہاتھ سے کیوں نہ پیش کیا گیا ہو

اگر مجھے مرنا پڑا
تو میں اس کے لیے بخوشی تیار ہو جاؤں گا

لیکن یہ ضرور پوچھوں گا
کہ فلسطین سے کشمیر تک
بوسنیا سے چیچنیا تک
اور عراق سے افغانستان تک
لاکھوں بے گناہوں کو
اور اُن بچوں کو
جو ابھی ماؤں کے شکموں میں تھے
کس ضابطۂ موت کے تحت مارا گیا؟
کیا ان کی موت کو مشیتِ ایزدی سمجھا جائے؟
کیا واقعی وہ اسی طرح مرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے؟
کیا محبت اور موت کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے؟
اور کیا پیدا ہوئے بغیر بھی مَرا جا سکتا ہے؟
مجھے امید ہے
کہ میرے ان سوالوں کو
اتنا معصوم اور سادہ نہیں سمجھا جائے گا
میں جانتا ہوں
ان کا جواب کسی کے پاس نہیں
مارنے والوں کے پاس بھی نہیں
پھر بھی میں اور کسی سے نہیں تو موت سے ضرور پوچھوں گا
کہ اُن جنے بچوں کو

کس خدائی قانون کی رُو سے رحم بدر کیا گیا
اور بارودی سرنگیں
کس فرشتے کی ایجاد ہیں
اور وہ جنت کیسی ہو گی
جو خودکش دھماکوں کے بدلے میں ملتی ہے
اور کیا جہنم کے لیے
آسمان پر کوئی جگہ نہیں بچی تھی؟

اگر مجھے مرنا پڑا
تو میں بچوں سے باتیں کرتے ہوئے مرنا پسند کروں گا
اور اگر موت کو کہیں اور جانے کی جلدی نہ ہوئی
تو اُسے ڈھیر ساری نظمیں سناؤں گا
شاید اُس کا دل پسیج جائے
اور وہ اُس روز
میرے علاوہ
باقی مرنے والوں کی جان لینا ملتوی کر دے
اور کراچی اور کوئٹہ جانا بھول جائے

اگر مجھے مرنا پڑا
تو موت سے کچھ دیر خاموش رہنے کی درخواست کرتے ہوئے

اپنا پسندیدہ میوزک سُنوں گا
اور ہمیشہ کی طرح
وائلن اور پیانو کی دھنوں پر امنڈ آنے والے
آنسو چھپانے کی کوشش ہرگز نہیں کروں گا
موت کی موجودگی میں تھوڑا رو لینا
اور پرانی یادوں کو تازہ کرنا
اور پاس بیٹھے ہوؤں سے
رسول حمزہ توف کی کوئی نظم سنانے کی فرمائش کرنا
کتنا رومانٹک لگے گا
اور دوستوں میں
انوار فطرت کا ہاتھ تھامنا مجھے سب سے اچھا لگتا ہے
سُن رہے ہو انوار فطرت!
یہ بھی ہوسکتا ہے
کہ دل ناگاہ کہیں رُک جائے جہاں کوئی نہ ہو
اگرچہ یہ سب کچھ اداس کر دینے کے لیے کافی ہوگا
لیکن میں مسکراتے ہوئے دھیرے دھیرے......
خیر چھوڑیں ابھی سے اداس ہو کر
موت کا مزہ کرکرا کیوں کروں
ابھی تو ماں زندہ ہے
اور اُس کے آنسو

میرے لیے کسی لائف سیونگ ڈرگ سے کم نہیں

اگر مجھے مرنا پڑا
تو میں ایک ہی بار مرنے کی خواہش کروں گا
زندگی میں بار بار مرنے کا تجربہ کئی بار ہوا
موت کے سمے اس تجربے کو دہرانا لاحاصل ہوگا
تاہم اسے میری آخری خواہش نہ سمجھا جائے
جو میں نے ابھی تک خود کو بھی نہیں بتائی، نہ بتاؤں گا
اگر مجھے مرنا پڑا
تو میں موت کی ایکٹنگ نہیں کروں گا، سچ مچ مروں گا
اور اُن لوگوں خصوصاً اُن شاعروں کی طرح
جو زندگی ہی میں اپنی تاریخ لکھوا لیتے ہیں
مر کر بھی زندہ نہیں رہوں گا
تاہم اگر، اے روحِ عصر، مجھ سے پوچھا گیا
تو میں تاریخ کے صفحات کے بجائے
اپنی نظموں میں، تمہارے ساتھ درگور ہونے کو ترجیح دوں گا!

نظمیہ

وقت جماہی لیتا ہے
اور خواب اور آنسو
آنکھوں سے پھسل کر
دل کی گہرائیوں میں جا گرتے ہیں

کتابوں میں زندگی تلاش کرنا بے سُود ہے

کتابوں سے بہت کچھ مل سکتا ہے
جس طرح کچرے کے ڈھیر
اور ردّی کاغذوں کے انبار سے
رزق تلاش کرنے والے بچوں کو
بہت سی بیکار چیزوں کے ساتھ
کچھ کارآمد اشیاء بھی مل جاتی ہیں

کتابوں میں رکھے ہوتے ہیں
الفاظ کا روپ بنائے ہوئے
طلائی سکے اور کرنسی نوٹ

جن سے پبلشرز کی جیبیں اور اکاؤنٹس بھرے رہتے ہیں
اور ان کے بچوں کے نام پر
خریدی ہوئی پیپر مَنی کا گراف بڑھتا رہتا ہے
اور غریب شاعر اور ادیب
جنھیں وہ مفت میں بھی نہیں چھاپتے
مسوّدوں کے کشکول لیے
سالوں ان کے دفتروں کے باہر
ایک ہی جگہ پر کھڑے رہتے ہیں

کتابوں میں سمجھ میں نہ آنے والی باتیں ہوتی ہیں
اسی لیے ذہنی طور پر بیمار اور ناخواندہ معاشروں میں
کتابوں کا ریپ ایک عام سی بات ہے
لیکن کتابیں اپنی بے حرمتی پر کچھ نہیں کہتیں
کسی ایف آئی آر کا مطالبہ نہیں کرتیں
پھٹے ہوئے خوبصورت ڈسٹ کورز میں چُھپی
خاموشی سے الماریوں میں
یا کم استعمال ہونے والے تہہ خانوں کے فرشوں پر
گرد کی چادر اوڑھے پڑی رہتی ہیں
اس کے باوجود
علم و ادب سے حاملہ ہونے کی پاداش میں

دریابرد کردی جاتی ہیں
یا جلا دی جاتی ہیں

کتابوں سے نکلتے ہیں حملہ آور
آہنی خود اور زرہ بکتر پہنے ہوئے
اور دلوں اور ذہنوں کے ہر گوشے میں پھیل جاتے ہیں
اور افکار کی غارت گری
صدیوں تک جاری رہتی ہے
کتابوں سے پھوٹنے والی جنگیں کبھی ختم نہیں ہوتیں
کتابوں میں تاریخ دندناتی ہے
اور لہو سے تربتر اوراق پر
گھوڑے بدک کر بے قابو ہو جاتے ہیں
تلواریں چمکتی ہیں
خیموں اور صحیفوں کو آگ لگ جاتی ہے
اور پڑھنے والوں کی آنکھیں
دھوئیں سے بھر جاتی ہیں

کتابوں سے نکلتے ہیں
خدا اور دیوتا
بوڑھے کاہن اور جادوگر عورتیں

عقیدے اور عقیدوں کی سختی سے بگڑے ہوئے چہروں والے
عبادت گزار
یا پھر بادشاہ اور ملکات
شہزادے اور شہزادیاں
یا غلام اور کنیزیں
کتابوں سے (عام) انسان بہت کم برآمد ہوتے ہیں

کتابوں میں ہوتے ہیں قصے کہانیاں
شاعری اور اقوالِ زریں
اور کتابوں میں ہوتے ہیں عبداللہ حسین
اور قرۃ العین
اور مجید اور رشید امجد ین
کتابوں سے اٹھنے والی بوسیدہ مہک
کسی پرانی شراب سے کم نشہ آور
اور کسی مہنگے برانڈ کے فرانسیسی پرفیوم سے
کم خوشبودار نہیں ہوتی
اکثر حواس پر چھا جاتی ہے
اور لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں
یا اس سے الرجک ہو کر
کتابیں کھولنا اور پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں

لیکن کچھ خود کار مصنف پھر بھی دھڑا دھڑ
نئی کتابیں لکھنے اور چھپوانے سے باز نہیں آتے

کتابوں میں آباد رہتے ہیں
قہوہ خانے اور مطبخ اور شیشہ کیفے اور ناچ گھر
نرتکیاں اور ناریاں رقص کرتی ہیں
اور پہرے دار گشت کرتے ہیں
کتابوں کے صفحات میں
تہذیبیں عروج و زوال سے ہمکنار ہوتی رہتی ہیں
اور متن سے باہر حاشیوں میں
ایک نیا ورلڈ آرڈر جنم لیتا ہے
اور کسی بحث اور اندراج کے بغیر
اقوامِ عالم ایک نئے یک نقاطی ایجنڈے پر متفق ہو جاتی ہیں
جس کے تحت
بُلٹ پروف جیکٹس
اور اندھیرے میں دیکھنے والی گاگلز پہنے ہوئے میرینز
دہشت گردوں کا پیچھا کرتے ہوئے
خواب گاہوں، اسکولوں،
مسجدوں، لائبریریوں اور عجائب خانوں میں گھس جاتے ہیں
اور جب ہزاروں لاکھوں روحیں جسموں سمیت پامال ہو جاتی ہیں

تو امن افواج
قیمتی انسانی جانوں کو بچانے کے لیے
مفت غذائی پیکٹس، پانی اور دودھ کی بوتلیں
اور اپنی طبع کی ہوئی کتابیں تقسیم کرتے ہیں
تاکہ کیمپوں میں خوراک اور تعلیم کی قلت نہ ہو
اور قاتل ملکوں کی معیشت اور ثقافت قائم رہے

چار دانگ
کتابوں کے اندر
جب صبح ہو رہی ہوتی ہے
تو ہمارے ہاں لوڈ شیڈنگ کے باعث
شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا ہوتا ہے
یا کسی ناگہانی کے ڈر سے
مکمل بلیک آؤٹ......
تاریکی میں ساری آوازیں گم ہو جاتی ہیں
یہاں تک کہ موبائل سروس بھی بند ہو جاتی ہے
صرف اذانوں کی صدائیں گونجتی ہیں
اگرچہ دنیا بھر کی آسمانی اور زمینی کتابیں
روشنی اور توانائی سے لبالب بھری ہوئی ہیں،
مگر ہمارا منبعِ نور قصرِ صدارت ہے

جہاں چمک دمک کی اتنی فراوانی ہے
کہ دن اور رات کی تمیز مشکل ہے
اور ایک اندازے کے مطابق
اس نعمتِ خداداد کا فیض
نسل در نسل جاری رہے گا
لیکن جمہور کے گھروں میں چولہے
اور قبروں کے چراغ
گیس اور تیل کی بندش کی وجہ سے اکثر بجھے رہتے ہیں
اور گاڑیاں چلنے کے بجائے
سڑکوں پر لمبی لمبی قطاروں میں کھڑی رہتی ہیں

کتابوں میں بھری ہوتی ہے موت
بارود کی طرح
الفاظ کی جگہ بندوقوں کی گولیاں رکھی ہوتی ہیں
کتابوں میں چُھپے ہوتے ہیں
خودکش بمبار
جو اچانک نکل کر سامنے آجاتے ہیں
اور سب کچھ بھک سے اُڑ جاتا ہے
کتابیں پڑھتے ہوئے
آنکھیں یکایک کسی مائن پر جا پڑتی ہیں

یا کٹے ہوئے انسانی اعضا پر
اور ابکائی روکنا مشکل ہو جاتا ہے
واضح رہے
کتابوں میں آج کل کچھ بھی ہو سکتا ہے
زندگی کے سوا......
احتیاطاً ان سے دُور رہنا بہتر ہے!

اندھیرے کا گیت

اندھیرے کی بارش ہوتی ہے
اور ہم اپنے لیے
ایک روشن خواب کی پناہ مانگتے ہیں
اور نہیں جانتے
کہ مصور کے رنگوں میں اتر کر
رات نیلی کیوں ہو جاتی ہے!
اندھیرا روشنی کی آہٹ پاتے ہی غائب ہو جاتا ہے
کونوں کھدروں اور سوراخوں میں گھس جاتا ہے
بعض سوراخ تو روحوں کے آر پار ہوتے ہیں
جن میں سے گزر کر

اندھیرا دوسری جانب جا نکلتا ہے
کیا دوسری جانب بھی اندھیرا ہے
یا وہاں بھی اسی طرح
کسی بڑے چھید کی اتھاہ گہرائی میں
ایک روشنی کا گماں
دوسرے گمان میں گم ہوتا رہتا ہے
کیا وہاں بھی
ایک تاریکی دوسری تاریکی سے
اسی طرح لذت کشید کرتی ہے
جس طرح ہم
اپنی اداسی کی اذیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں
اور خود لذتی میں سرشار رہتے ہیں
اور عظیم شاعری کے جال میں الجھ کر
لفظوں کی بچی کھچی پونجی بھی ضائع کر بیٹھتے ہیں
روحوں کے چھید
لمحہ بہ لمحہ بڑھتے رہتے ہیں
اور زندگی دن اور رات کے درمیان
رینگتے، لہراتے سایوں کی طرح
ایک جانب سے دوسری جانب
دوسری سے تیسری...... تیسری سے چوتھی

چوتھی سے پانچویں اور پھر...... شش جہت
اور اسی طرح لامتناہی ابعاد میں
خاموشی سے گھٹنوں کے بل چلتی رہتی ہے
ایک بِل سے دوسرے بِل میں
کائنات کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف
یہاں تک کہ روحیں بلبلا اٹھتی ہیں
اور اُدھر خدا کے بے ستون آسمانی محلات میں
اندھیرا روشن ستاروں کے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے
اور موقع پاتے ہی وار کرتا ہے
اور اُن زمینوں تک جا پہنچتا ہے
جہاں دلوں کی کاشت کاری ہوتی ہے
اور دماغوں کے پھول کھلتے ہیں!

فاصلوں کے کینوس پر سفر کی تصویر

صبح کے گرد آلود راستوں میں
شبنم سے بھیگے پروں کے ساتھ
سرحد پار کرتے ہوئے
ایک پرندہ
زندگی کی لکیر پار کر گیا!

Mir Zaheer abass Rustmani
03072128068

بے آغاز راستوں کا سفر

یہ خواب ہی تو ہیں
جو دروازوں کے پار سے دکھائی دیتے ہیں
اور ہوا میں اُڑتے ذرّوں کی طرح
آنکھوں میں گھس آتے ہیں
بے پٹ کی کھڑکیاں
کاغذوں اور گتوں سے بند کرتے کرتے
عمریں پھڑ پھڑانے لگتی ہیں
نیند کے موسم بے اعتبار ہوتے ہیں
جاگنے سے پہلے
وقت ضرور دیکھ لینا

کبھی کبھی سوتے میں
کلائی کی گھڑی رُک بھی جاتی ہے
اور دیکھو
سائیڈ ٹیبل پہ رکھی ڈائری میں
خواب لکھتے ہوئے
رومت پڑنا
ورنہ بچے تم پر ہنسیں گے
اور بیوی
قابلِ رحم نظروں سے تمہاری طرف دیکھے گی
سب سے چھوٹی بیٹی تو ضرور پوچھے گی
''پاپا کیا ہوا؟''
''پاپا کیا ہوا؟''
تو تم اُسے کون سا خواب سناؤ گے
کیسے بتا پاؤ گے
کہ پہلے پہل گاؤں سے شہر آتے ہوئے
مال گاڑی کے ڈبے
تمہیں قطار میں رکھی ہوئی
ماچسوں کی ڈبیوں جیسے کیوں لگے تھے،
کیسے سمجھاؤ گے
کہ آنکھوں کے پیچھے

اندھیرے کی کوئی واضح تصویر نہیں ہوتی
یہ تو تیز روشنی میں بھی نظر نہیں آتا
اسے دیکھنا ہو تو
بلی کی طرح چھلانگ لگا کر
رات کے عظیم ڈھیر میں گھس جاؤ
صبح تک سارے خواب
اُدھڑی ہوئی سفید روئی میں بدل جائیں گے،
کیسے کہو گے
کہ گالیوں کے شور
اور آنسوؤں کی بے آواز کنمناہٹ میں
زندگی کرتے ہوئے
باخ اور بیتھوون کی دُھنیں سُننے کی
اذیت کسی کے ساتھ شیئر نہیں کی جا سکتی
وقت تو ویسے بھی
ایک ازلی بہرے پن میں مبتلا ہے
اور راستے بس راستے ہوتے ہیں
چلتے رہو
چلتے رہو تمام عمر

اب بچپن کتنا مختلف ہے

زندگی ایک معمولی کمپیوٹر ڈسک میں محفوظ،
رِسٹ واچ چلتی رہے یا رُک جائے
سب کچھ فقط ایک کلِک (Click) کے ساتھ
شروع ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے!!

سارے خواب کلیشے ہیں

پورچ کے چپسی فرش پر
ڈاکیا خط پھینک کر چلا جاتا ہے
گھنٹی بجائے بغیر......
آنکھوں کے شہر میں
کسی دُور افتادہ گاؤں کا
پس ماندہ لینڈ اسکیپ ابھر آتا ہے
دیواریں بغیر پلستر کے
ننگی سچائیوں کے ساتھ
افسردہ بچپن کی یادیں لیے
دھوپ میں استادہ ہیں

سورج ایک گوشے سے اُٹھ کر
دوسرے گوشے میں بیٹھ جاتا ہے
لیکن ہم روشنیاں تلاش کرتے ہوئے
سایوں میں ڈھل جاتے ہیں
شام کا جادو
خوابوں کی سمفنی میں تبدیل ہو جاتا ہے
آنکھیں اگر ایک بار
وقت کے اندھے کنویں میں گر جائیں
تو انہیں نکالنے کے لیے
ڈول ڈول عمر کا سارا پانی باہر انڈیلنا پڑتا ہے
پاؤں کی مَیل دھوئی جاسکتی ہے
لیکن ٹیٹو کی طرح
بدن کی جِلد پر نقش ہوئے
آبائی مناظر
کھرچنے سے مٹائے نہیں جاسکتے
اپنے علاقے سے نکلے ہوئے ہم،
کوئی شہر فتح کر پائے نہ محبت جیت سکے
مفتوح انسان
پرچھائیوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں
اندھیرے میں دیکھنے کے لیے

کاکروچ بننا ضروری ہے
جس کی مرکب آنکھوں کی بینائی
انسان کی بصارت سے کئی گنا زیادہ تیز ہوتی ہے
رات کی جھاڑیوں میں
ستارے جگنوؤں کی طرح چمکتے ہیں
یہ ٹیکنالوجی بہت سے درختوں کو سکھائی جارہی ہے
جلد ہی چھاؤں دھوپ میں بدل جائے گی
منہ سے روشنی نکالنے والی چڑیا
اب کہیں دکھائی نہیں دیتی
اگلی فصل کے لیے
پیڑوں پر کوئی پھل باقی نہیں
دن اور رات کے سنگم پر
اب کوئی شفق رنگ دریا نہیں بہتا
سارے خواب کلیشے ہیں
دھول اور دھوئیں کے کارنیوال میں
موت گیت کی طرح گونجتی ہے
اور محبت کی آواز
کہیں سنائی نہیں دیتی......!

ابدی کھیل

وقت کے نورانیے میں
تہذیبیں زوال کی سیاہی اوڑھ لیتی ہیں
لیکن اکاس گنگا کے
اَن گنت اَن بجھ ستارے
لُک چھپ لُک چھپ
کھیلتے رہتے ہیں!

کائنات کا آخری گیت

مجھے دوستوں نے بالکل تنہا کر دیا ہے
وہ میرے لفظوں کو سانس بھی نہیں لینے دیتے
اور ان پر اپنی قبروں کی مٹی ڈال دیتے ہیں
اِس کے باوجود ایک لفظ
کبھی کبھی اتنا پھیل جاتا ہے
کہ آنکھیں اُس کا نصف محیط بھی نہیں دیکھ سکتیں
دیکھو، میں ایک بار پھر تمھارے سامنے ہوں
ایک ازلی خواب نامہ رقم کرتے ہوئے
روشنی میرے ہاتھوں کی لکیروں میں
گرم گرم سیال لاوے کی طرح بہہ رہی ہے

اُداسی ایک بار پھر میرے وجود سے گزر رہی ہے
اپنی لاکھوں سال پرانی گمبھیرتا کے ساتھ
لیکن اب میں کوئی نظم نہیں لکھوں گا
یہ جانتے ہوئے بھی
کہ ہر انتہا پر
ایک اور ابتدا جبڑے کھولے منتظر ہے
میں کسی کے نقشِ پا پر اپنی قبر نہیں بنا سکتا
کیا چلنے کے لیے راستہ بہت ضروری ہے؟
روشنی بل دار ہو کہ سیدھی
خلا کی بے لمس تاریکی تو دور نہیں کر سکتی!
دیکھو، میں یہاں لکیریں کھینچتے کھینچتے
دائروں کی ابدیت میں نابود ہو چکا ہوں
اور وہاں، تمہارے جسم کے ساحل پر
وقت کا بہاؤ
آہستہ آہستہ شانت ہوتا ہُوا
دم توڑ رہا ہے
قدموں کی رفتار تیز کرو!
کائناتی کلاک سے باہر
ایک دائمی لمحے کی پکار
تمام بازگشتوں پر غالب آ رہی ہے

ابدی ترتیب سے بھٹکا ہوا وجود
اپنے خلیوں اور سالموں میں چھپا ہوا سچ تلاش کرتا ہے
کیا زندگی صرف اس لیے ہے
کہ ہم ایک بے مہلت رات کے انت پر
آنسوؤں کے چراغ روشن کریں
اور شہابِ ثاقب کی طرح جل بجھ کر
نامتناہی اندھیروں کے غبار میں گم ہو جائیں؟
ایک بے تھاہ کھائی......
اور سوالیہ ہُک سے لٹکی ہوئی کائنات
نادیدہ پانیوں پر تیرتی ہوئی
بہت سی لاکلامی، بہت سا کلام
الاپ......اور معدوم ہو جانے کی اذیت......
دُور......کسی لامکاں کے بے جہت کبودی گوشے میں
کوئی اپنی غیر مرئی انگلیوں سے
پیانو کو چھیڑتا ہے
اور کہیں بہت قریب سے
ساکن اور بے آواز آسمانی گیت سنائی دے رہا ہے
تالمودی راستوں کے اطراف میں
صلیبی پھول کِھل رہے ہیں
لفظوں اور خوابوں کی کلوننگ نہیں کی جاسکتی

روشنی، اجازت طلب کرنے کا وقت آ پہنچا ہے
الفراق! الفراق!!
اتنی بڑی عمارت سے رخصت کرتے وقت
کیا تم مجھے گیٹ تک چھوڑنے بھی نہیں آ ؤ گی؟

کب تک ''یادفراموش'' کھیلو گے؟

دوستو!

اب میرے پاس بچا ہی کیا ہے
ایک خواب اور تھوڑی سی تنہائی
تم وہ بھی چھین لینا چاہتے ہو
تمھارے روز و شب
مجھے شکست خوردہ دیکھنے کی حسرت میں گزر رہے ہیں
تمہارے جذبے نمائشی
اور الفاظ کھوکھلے ہو چکے ہیں
افسوس کہ تم نہیں جانتے
خود فریبی کا کوئی انت نہیں ہوتا

یہ جہاں سے شروع ہوتی ہے
وہیں پر ختم ہو جاتی ہے
میں نے اپنے ایک خواب اور تھوڑی سی تنہائی کے ساتھ
زندہ رہنا سیکھ لیا ہے
تمہیں پتہ ہی نہیں چلے گا
اور میں ایک خواب سے نکل کر
دوسرے خواب میں داخل ہوتا رہوں گا
اور زندہ رہوں گا
ہر زمانے کی اسطورہ کے ساتھ
میں زندہ رہوں گا
پھولوں اور پودوں میں
پہاڑوں، آبشاروں اور جھیلوں میں
نیلی گھاس کے رقبوں
گلیوں میں کھیلتے بچوں
اور لکیروں کی طرح پھیلے راستوں میں
اور سب سے بڑھ کر
تم پر حملہ آور ہونے والی سفاک یادوں میں!

ڈسٹ بِن میں زندگی

کہاں سے شروع کرو گے
راستہ
کس دہلیز پر
رکو گے
اور کس گلی سے
گزرو گے
عمر کے کس حصے تک
زندگی شمار کرو گے
اور کون سے لمحے سے
موت کا حساب لگاؤ گے

پہلی اور آخری نظم کے درمیان
کتنے لفظ تھے
جنہیں تم نے
لکھے اور پڑھے بغیر مٹا دیا
اَن گنت صدیوں کے انبار میں
تمہارے زمان و مکاں دبے پڑے ہیں
خود کو پرزہ پرزہ دیکھ کر
حیران کیوں ہو
زندگی ٹھکانے ڈھونڈتی ہوئی
لفظوں کا ڈھیر بن گئی ہے
اب اور کتنے کاغذ ضائع کرو گے؟

ایک معمولی آدمی کی موت

میں ایک کائناتی لمحہ
ایک معمولی جسم اوڑھے ہوئے
اِس زمین پر
پہلی بار شہر آئے ہوئے بچے کی طرح
میری خوشیاں، میرے دُکھ
سب چھوٹے چھوٹے ہیں
میں کسی کے ساتھ تصویر بنوا کر
خوش ہو جاتا ہوں
اور کسی کو تنہا دیکھ کر اُداس
کوئی نہیں جانتا

کہ میرے اندر خوشیوں اور دکھوں کی
کتنی کہکشائیں گردش میں ہیں
میں جب مروں گا
تو ایک زمینی آدمی کی موت ہو گی
لوگ سمجھیں گے
ایک معمولی آدمی مر گیا
یہ کوئی نہیں جان سکے گا
کہ انبساط و غم کے کتنے نظامِ شمسی
اپنے اپنے مداروں سے ٹوٹ کر
بکھر گئے ہیں کائنات کی لامحدود وسعت میں
کیونکہ لوگ تو
بالکل قدموں میں گری ہوئی چیز بھی نہیں دیکھ سکتے!!

نظم دیوی

میں اُسے نہیں ملتا
وہ مجھے ملنے آ جاتی ہے
اطلاع دیے بغیر

میں اُسے نہیں سوچتا
وہ مجھے سوچتی رہتی ہے
اور دیکھ لیتی ہے مجھے
درختوں اور مکانوں کی آنکھوں سے

میں اُسے نہیں چُھوتا

مگر وہ بھگوئے رکھتی ہے مجھے
نادیدہ لمس کی بارشوں میں

میں اُسے نہیں لکھتا
وہ مجھے لکھتی رہتی ہے
اَن کہے، اَن سنے لفظوں میں
اور پڑھ لیتی ہے مجھے
دنیا کی کسی بھی زبان میں

میں کہیں بھی ہوں
وہ مجھے ڈھونڈھ لیتی ہے!

قریبِ شب

رات قریب ہے
اور ابھی آدھا دن بھی نہیں گزرا
آدھی بالکونی پر
دھوپ ہے
اور آدھی کھڑکی
چھاؤں سے ڈھکی ہوئی ہے

رات قریب ہے
اور ابھی آدھا خواب بھی تیار نہیں ہوا
حالانکہ پوری دنیا کے لوگ

جُتے ہوئے ہیں کام میں
اور بُن رہے ہیں
اپنی اپنی آنکھوں میں
ایک جیسے خواب

رات قریب ہے
اور ابھی آدھی دنیا
رت جگے کی لذت سے
اور آدھی
نیند کی نعمت سے محروم ہے

رات قریب ہے
اور ابھی تک آدھا چاند
اور آدھے ستارے بھی روشن نہیں کیے جا سکے

رات قریب ہے
اور میں ابھی تک
آدھی نظم بھی نہیں لکھ سکا!

رات میری سمجھ میں کبھی نہیں آ سکی

شاعری کرتے ہوئے
رات میری سمجھ میں کبھی نہیں آ سکی
دل میں یوں اُترتی ہے
جیسے دُھند آلود جاڑے میں
ہلکی ہلکی بارش
یا پھر اوس کی طرح
جسے گرتے ہوئے
کوئی نہیں دیکھ سکتا!

حالتِ خواب میں

اپنی پسندیدہ چیزیں دیکھ کر
خوش ہونا
اور من چاہے لوگوں سے مل کر
باتیں کرنا
ساتھ سوئی ہوئی
بیوی کی نیند میں خلل نہیں ڈالتا
لیکن رات کے بعد
پھر وہی دن ہے
سرکس کے جوکر جیسا دن!

موت کے کنویں میں چکر کاٹتے ہوئے
اُس نے زندگی کی لکیر پار کر لی تھی
اور دم بخود خواب کے غلبے میں
ہجوم کے ساتھ
تالیاں پیٹتے ہوئے
میری آنکھوں میں نمی اور دُھند اُتر آئی تھی
وہ میرے بچپنے کا آخری دن تھا
اور شاید یہیں سے
وہ طویل رات شروع ہوتی ہے
جو نیندوں، رت جگوں اور خوابوں کو

روندتی ہوئی
سمندروں اور زمینوں میں سرایت کرتی ہوئی
ایک ابدی پھیلاؤ سے جا ملی ہے!

میں دن بھر جاگنے کی مشق کرتا رہتا ہوں
مگر رات
گھروں کو روشن کرنے والی
مصنوعات کے ساتھ مسکراتی ہوئی ماڈل گرل،
دل میں یوں اُترتی ہے
جیسے کوئی پرانی یاد
جو دیکھتے ہی دیکھتے
کتابوں سے اُٹھنے والی بوسیدہ مہک کی طرح
حواس پر چھا جاتی ہے

شاعری کرتے ہوئے
رات میری سمجھ میں کبھی نہیں آ سکی!

نظمیہ

زیرِ آب صدیوں کی کہانی
کہاں تک لکھو گے
سمندر اور دوات
دونوں خالی ہیں!

کاغذ کی تنہائی

اے عورت!
تمہیں دھول میں اٹے اور پسینے میں ڈوبے ہوئے
چہرے خوبصورت لگتے ہیں
یقیناً تمہارے وجود میں
کوئی گہرا گھاؤ ہے
فلسفوں، نظریوں اور عقیدوں سے ماورا
دائیں اور بائیں، دونوں پہلوؤں سے جدا
اَن دیکھی ازلوں تک پھیلی جڑوں والا گھاؤ
میری نظموں کی طرح بظاہر سادہ مگر عمیق
اِسی لیے تو

تم میرے ایک خواب میں کھلکھلا کر ہنسنا چاہتی ہو
اور دوسرے میں
دھاڑیں مار کر رونا
اور اتنا بھی نہیں جانتیں
کہ جہاں ہمارے اردگرد کے لوگ
لفظوں کا سچ سمجھنے سے قاصر ہوں
اور جھوٹ کے دفتر پر
پختہ یقین رکھتے ہوں
وہاں ایک خواب کا بیج بونا
کائنات تخلیق کرنے سے زیادہ مشکل ہے
بیک وقت زندگی اور شاعری کرنے کے باوجود
انسان ہر حال میں مخلوق ہی رہتا ہے
اور سچ تو یہ ہے کہ
کاغذ کی تنہائی
دنیا کی ہر تنہائی سے بڑی ہے
ہم جن کلاں خوابوں کی بات کرتے ہیں
خدا کی نظر میں وہ سب کلیشے ہیں
دنیا ایک چھوٹے سے خواب سے شروع ہوئی تھی
اور بالآخر
ایک بڑی تباہی سے دوچار ہے

زمین کے ایک سرے پر بیٹھ کر
آسمان دیکھنا
نسبتاً آسان عمل ہے
لیکن شاعری اور زندگی دونوں ہی
زمین کے کناروں سے الگ ہو جانے والے
سمندروں کی طرح بے کنار ہیں
ان میں اُترنے کے لیے
جسم کو ناؤ بنانا ضروری ہے
ناؤ کاغذ کی ہو یا کچی مٹی کی
سفر کی پہلی شرط ہے
لنگر اُٹھانا اور بادبان کھولنا تو بعد کی باتیں ہیں
اُن زمانوں کی
جو ابھی ہماری دسترس میں نہیں
یقین کرو!
مفلسی کے دنوں میں
محبت زیادہ آسودہ ہوتی ہے
اور سیاحوں سے بھرے ہوئے شہر
اندر سے اتنے بے آباد ہوتے ہیں
کہ تم اپنی ویرانیاں بھول جاؤ
سو، گزرے ہوئے زمانوں

اور آنے والے وقتوں کی تلاش میں
اتنی دور مت جانا
کہ واپسی کا راستہ بھول جائے
اپنے حال میں مست رہو
اور جان لو
کہ باغِ عدن سے نکلے ہوئے
آدمی نے اپنے لیے
واپسی کا راستہ
اتنا مشکل بنا لیا ہے
کہ جسے مَرے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا
اور یہاں تو
پرچھائیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے
موت بھی مجسّم نہیں ملتی
اور تم
پانی کے ساتھ پانی ہونے کے لیے
روح کا سیّال
کس حیاتیاتی عمل سے گزارو گی؟
کچھ رشتوں کی
جینیاتی رمز ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی!!

جنگیں اور نظمیں ختم نہیں ہوتیں

صلاح الدین!
تمہیں جنگل کی تلاش تھی
تمہارا جنگل تو میں ڈھونڈ لوں گا
تمہارا جنگل تمہارا شاوک تھا
یہیں کہیں ہو گا
تمہارے ہی شبدوں کے بھیتر
شتابدیوں، آتماؤں اور کالبدوں کی بھیڑ میں
نرتکیوں، ناریوں کی اوٹ میں
چولیوں، ہم جولیوں کی الوتا میں منہ بسورتا
کون و مکان کی بیضوی گولائیوں میں

کہیں پھسلتا ہوا

کسی پارک میں

خدا کا جھولا جھلاتا

ازل اور ابد کے سی سا کے دونوں طرف خود ہی بیٹھا ہوا

تخلیقی تنہائیوں میں

کھویا ہوا

رویا ہوا

یا تمہاری کسی محبوبہ کے دودھیا سینے پر سر رکھ کر

آدھا جاگا، آدھا سویا ہوا

یا تم سے کبھی نہ مل سکنے والی کسی سانولی سلونی عورت کی

غیر مرئی کوکھ میں

بویا ہوا

روشنی کا بیج

جو ابھی اُگ پڑے گا

دیکھتے ہی دیکھتے

زمین لالٹینوں سے

اور آسمان ستاروں سے ٹمٹمانے لگے گا

چاروں طرف رات کا آرکسٹرا بج اٹھے گا

اندھیرے کی آواز

اور بھی پُراسرار، اور بھی رومان پرور ہو جائے گی

اور موسیقی تیز بارش کی طرح
ہر جماد و ذی روح کو جل تھل جل تھل کر دے گی
تمہارا جنگل، تمہارا شاوک تھا
بانسری بجاتا ہوا
گوپیوں سے بھر جائے گا
لیکن صلاح الدین! تم کہاں ہو گے؟
میں تمہیں ڈھونڈنے کہاں جاؤں گا؟
تم اب جنگل نہیں رہے، درخت بھی نہیں رہے
کہ اپنی شاخیں
دریچوں جیسی لڑکیوں کے دلوں اور روحوں کی بالکونیوں تک پھیلا سکو
خلا بھی نہیں رہے کہ آسمان کو فِل کر سکو
آتما بھی نہیں رہے کہ پرماتما کو خط لکھ سکو
سمندر بھی نہیں کہ کسی ساحل سے ٹکرانے، سوری، ملنے آ سکو
بادل بھی نہیں کہ کسی استری کی پیاسی گھاٹیوں میں اتر سکو
سایہ بھی نہیں رہے کہ کسی جسم کا روپ دھار لو
یاد ہے ایک بار میں نے کہا تھا!
''نظم کے درخت کا سایہ نہیں ہوتا''
اور تم پہلی بار
بس حیرت اور خاموشی سے مجھے دیکھتے رہ گئے تھے
کیونکہ اُس وقت تم

کسی گھنی گہری نظم کی نرواِت چھاؤں میں تھے
ورنہ تم تو
ہر اچھی بات اور اچھی نظم کا حساب فوراً ہی برابر کر دیتے تھے

صلاح الدین!
تم انتم یدھ میں
اتنی آسانی سے پسپا کیوں ہو گئے
جانتا ہوں تم لڑنا نہیں چاہتے تھے
پھر ہر یدھ میں ہیرو کیوں بن جاتے تھے
مجھے دیکھو، میں بھی لڑنا نہیں چاہتا
لیکن مسلسل حالتِ جنگ میں ہوں
اور لگا تار پسپا ہو رہا ہوں
کیونکہ میں اپنے علاوہ کسی پر حاوی نہیں ہو سکتا
لیکن تم......؟
سمجھ گیا
تمہاری کوئی محبوبہ تم سے ناراض تھی
اور تم اُس کے ہاتھ میں دل رکھے بغیر شہر پناہ سے نکل آئے تھے
تم تو جیسے برقی رتھ پر سوار تھے
کائنات کی حد پار کرتے ہوئے بھی مڑ کر نہ دیکھا
کہ رجزیہ اشعار پڑھنے والیاں کب کی خاموش ہو چکی تھیں

اتنا بھی نہ سوچا
کہ تمہاری محبوبائیں اور تمہاری نظمیں ایک دوسری ہی کی کایا کلپ ہیں
جنھیں جدا جدا کرنے کے لیے
نئی سیمیا، نئے کیموس کی ضرورت ہے
انھیں ایک ساتھ چھوڑ دینا
کہاں کی اذیت ناکی ہے!
اب وہیں رکو، جہاں تک پسپا ہو چکے ہو
اس سے آگے موت تمہارا پیچھا نہیں کرے گی
رکو جب تک کہ جنگ ختم نہ ہو جائے
لیکن یار، جنگیں اور نظمیں ختم کہاں ہوتی ہیں
یہ تو چلتی رہتی ہیں
جب تک کہ وقت ہتھیار نہ ڈال دے
تم بھی اب رکو اور انتظار کرو
جب تک کہ تمہاری ساری محبوبائیں
اپنا اپنا انتظار نہ تج دیں
اور میں، تمہارا جنگل ڈھونڈ کر
تمہارے پاس نہ آ جاؤں
پھر ہم مل کر
وہاں چلیں گے
جہاں کوئی یدھ ہے نہ شترتا

جیت ہے نہ شکست
پسپائی ہے نہ پیش قدمی
صرف ایک ملکوتی حسن ہے،
تمہارے اور میرے پسندیدہ خواب کی ابدیت ہے
آسمانی آبناؤں پر بنے ہوئے نیلگوں راستے ہیں
جن پر ہم باتیں کرتے، نظمیں سنتے سناتے
جو گرز پہنے بنا، ملگجی پاؤں اٹھائے بغیر، دائمی واک پر نکل جائیں گے!!

(صلاح الدین پرویز کی یاد میں)

نظم کہانی

کہانی کار!
تم نے مجھے بہت سی نظمیں دی ہیں
اِس کے باوجود کہ میں تمہارا لفظ نہیں
ہوا کو سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے
مَیں نے کئی بار کھڑکی سے باہر جھانکا
اُداسی بہت دبیز تھی
مگر میں جانتا ہوں
کہ راستے ترتیب دیتے ہوئے
آنکھیں ہمیشہ مصلحت کے غبار میں گُم ہو جاتی ہیں
تمہیں دریا بنے بغیر سمندر سے ملنا آتا ہے

تو پھر مان لو
اَن بہے آنسو بھی عظیم ہو سکتے ہیں
دُکھ کسی ایک کا نہیں ہوتا
دُکھ تو سب کے ہوتے ہیں
لیکن یقین اور اظہار کے درمیان آنکھوں میں
ایک نمی سی تیرتی رہتی ہے
بارشیں پرائی سرزمینوں پر برسنا چاہتی ہوں
تو انھیں کون روک سکتا ہے
اعتراف کے بغیر سب رشتے بے یقین رہتے ہیں
اگر لفظوں کے بغیر کچھ لکھا جا سکتا
تو میں تمھارے لیے بھی ایک نظم لکھتا

کہانی کار!
جب تمھاری آنکھوں کے آسمان میں
آنسوؤں کی روشنائی سوکھ جائے
اور بدن کی زمین کا ملبوس بوڑھا ہونے لگے
اور تم کسی اور وجود کا چولا بدلنے کے لیے
اگلی بار آؤ
تو اپنی کہانی لکھتے ہوئے
ایک کردار میرے نام سے ضرور لکھنا

کیونکہ اگلی بار مَیں نہیں ہوں گا
مَیں تو پچھلی بار بھی نہیں تھا
اور اِس بار بھی نہیں ہوں
لیکن تمہیں خواب لکھنے کا تجربہ نہیں
تم نے صرف تعبیریں دیکھی ہیں
کہانی کار!
تم نے ابھی نظم نہیں لکھی!!

گوشۂ تنہائی

میں جاؤں گا وہاں
جہاں کائنات کی
ساری دشائیں مل کر
ایک انوکھی زاویہ نما
نک (Nook) بناتی ہیں
اور کچھ دیر بیٹھوں گا
خاموشی سے......!

اترائی کا سفر بھی مشکل ہوتا ہے

تم خواب ہو
اور میں تنہائی
میرے دل کے افق سے
سورج روز نکلتا ہے
اور تمہاری آنکھوں میں ڈھل جاتا ہے
نیندوں کے جنگل سے گزرتے ہوئے
میں تمہاری جانب جاتے رستوں پر
چلتے چلتے تھک جاتا ہوں
آدھی شب کے دونیم اندھیروں میں
چاند تمہارے جسم کی سولی پہ لٹکتا رہتا ہے

رات تمہاری زلفوں سے اتر کر
رانوں تک آ جاتی ہے
اک لمسیدہ پر چھائیں کو چھونے کی خاطر
ساری عمر سلیٹی ہو جاتی ہے
پھر بھی صبح نہیں ہوتی!

ایک عورت کی خواب گاہ میں

ایک عورت کی خواب گاہ میں
روشنی اور اندھیرا
باہم آمیز ہو جاتے ہیں

ایک عورت کی خواب گاہ میں
ایک مرد کے سوا
سب کچھ ہوتا ہے

ایک عورت کی خواب گاہ میں
کھلی کھڑکی سے

بارش در آتی ہے
اور ہوا پردوں کو چھیڑتی ہے

ایک عورت کی خواب گاہ میں
رات بیت جاتی ہے
لیکن سورج طلوع نہیں ہوتا
اور صبح کا انتظار طویل ہو جاتا ہے!

ساحلی عورتوں کے نام

سمندر تمہارے اندر ہے
اور تمہاری آنکھیں
وہ کھڑکیاں ہیں
جہاں سے تم نظارہ کر سکتی ہو
اپنے ساحلوں کا
اور دیکھ سکتی ہو
اپنی کشتیاں
مستولوں سے لپٹے بادبان
چٹانوں سے ٹکراتی لہروں کی
غضب ناکیاں

اور اُچھلے پانیوں میں
دم توڑتی وہیل مچھلیاں
بے شمار آبی پرندے
اور ایک جزیرہ
سیاحوں سے بھرا ہوا......!

خواب جہاں رستے بن جاتے ہیں

میرے خواب دیکھتے ہوئے
تمہاری آنکھیں
ڈوبتی شام کی طرح
خوبصورت اور اُداس لگتی ہیں
میری موجودگی کے لمس میں بھیگے ہوئے
تمہارے ہونٹ
مٹیالے بادلوں سے نکلتی ہوئی
قوسِ قزح کی کمان جیسے لگتے ہیں
میری بانہوں کے جنگل میں
تم درخت بن جاتی ہو

گھنی بارشوں کی آواز
اور پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹیں
تمہاری شاخوں سے ٹپکنے لگتی ہیں
میری قربت اوڑھے ہوئے
تمہارا جسم
رات کے کسی کنارے سے
چاند کی طرح طلوع ہونے لگتا ہے
اور گھاٹیاں سفید پھولوں سے بھر جاتی ہیں
میری باتوں کے سناٹے میں
تمہارے لفظ
رستہ بھول جاتے ہیں
اور تم رونے لگتی ہو
میرے ساتھ چلتے ہوئے
تمہارا ہاتھ
میرے ہاتھ میں رہتا ہے
اور میں تم سے بہت دُور نکل جاتا ہوں
تمہاری تلاش میں
خواب جہاں رستے بن جاتے ہیں!!

اپی لاگ (EPILOGUE)

میں تمہارے پاس تمام راستے تیاگ کر آتا ہوں
تمہارے سامنے پڑاؤ کرتے ہوئے
محض ایک لفظ کا فاصلہ طے کرنے میں
اپنے آپ سے زمانوں دُور چلا جاتا ہوں
اور تمہاری فاتح صدیوں کے درمیان
مفتوح عمر کی سانسیں پوری کرنے لگتا ہوں
مگر وہ ایک پل
جو تقدیر کا ہندسہ ہے
گنتی میں نہیں آتا
باہر موسم اپنے چاروں روپ بدل بدل کر تھک جاتا ہے

ازلوں اور ابدوں کے قطبینوں پر
لامتناہی وقتوں کی ڈھیروں برف جمی رہتی ہے
اور تم آتش دان کے پاس بیٹھی
باتوں کا لمس تاپتی رہتی ہو
کمرے کا آسمان تمہاری محبت کی طرح پھیلا ہوا ہے
لیکن میرے بے ارض قدموں کو
خلا بھی راستہ نہیں دیتا
میں ہر بار جنم لے کر
زندگی کا خواب
ایک عورت کی آنکھوں میں ہار جاتا ہوں
مگر اِس بار
میرے پاس ہارنے اور جیتنے کے لیے کچھ بھی نہیں
اب کوئی مہا یدھ نہیں
مجھے بچی ہوئی زندگی کے ساتھ
آخری بار مرنے دو!!

خوابوں میں مِس فِٹ آنکھیں

ابھی ابھی تم سے باتیں کرتے ہوئے
میں اپنی نیند سے بچھڑ گیا
تم وہ دُور کا راستہ ہو
جس پر چلتے ہوئے
وقت کے پاؤں شل ہو جاتے ہیں
ازل اور ابد کے درمیان
معلق زمانے
ایک لمحے کی بے انتہائی میں
تھک کر ڈولنے لگتے ہیں
دل کی سرزمین پر

اداسی گہری...... بہت گہری ہو جاتی ہے
کتابیں لفظوں کو چھوڑ کر
تمہاری صورت اختیار کر لیتی ہیں
اور کائنات کی بے بس تنہائی میں
صبحِ الست سے بھٹکتی ہوئی
شبِ سرخاب
کسی بجھے ہوئے سورج سے ہمکنار ہو جاتی ہے

کبھی کبھی رونے کے لیے
ایک نظم کافی ہوتی ہے
پھر بھی تمہارے ساتھ چلنے
اور جاگنے کی خواہش لیے
خوابوں میں مِس فٹ آنکھیں
تمہیں کیوں تعبیر نا چاہتی ہیں؟
جانتا ہوں
روشنی فاصلوں کا وہ خلا ہے
جسے پاٹتے ہوئے
ہونے اور نہ ہونے کا فرق مٹ جاتا ہے
تم یہاں بھی ہو
اور وہاں بھی

ازل بھی ہو اور ابد بھی
لیکن دُکھ تو یہ ہے
کہ میں تمہارے بیچ کہیں بھی نہیں!

میرے لیے خواب کون دیکھے گا؟

میں تمہارے لیے
بہترین زندگی
اور اپنے لیے
ایک خوبصورت موت کے خواب دیکھتا ہوں!

عورت اور محبت میں آدھے دکھ کا فرق ہے

ایک عورت نے
مجھے اتنی بار ہرٹ کیا ہے
کہ اب میں باقی ماندہ زندگی
با آسانی محبت اور فلسفے کے بغیر گزار سکتا ہوں
لیکن میں آدھی موت نہیں مرنا چاہتا
وہ اگر چاہتی
تو مجھے اپنے درد سے رہائی دے کر
میرا دکھ مکمل کر سکتی تھی
مگر میں جانتا ہوں
وہ کبھی ایسا نہیں کرے گی

کیونکہ آدھی محبت کی اذیت میں سرشار
وہ ایک مکمل عورت ہے
پُوری محبت کا دکھ اس کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا!

ایک عورت نے
میرے ساتھ تصویر بنوانے سے انکار کر دیا
کیونکہ وہ نہیں جانتی
کہ عظیم محبتیں
چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے کہیں کم تر ہوتی ہیں
حالانکہ بہت سے کوتاہ دل
اس کی قربت سے
خدمت کا خراج وصول کرتے ہیں
اور وہ سچ مچ اپنی عظمت پر خوش ہوتی ہے
یہ سوچے بغیر کہ محبت اور خدمت میں
اتنا ہی فرق ہے
جتنا مجھ میں اور اُن لوگوں میں!

ایک عورت کو
میں نے یقین اور اپنائیت کی
اُس میزان پر رکھنا چاہا

کہ جزا کے روز
اپنا سب کچھ
حتیٰ کہ خالی پن بھی اُس کے پلڑے میں ڈال دیتا
تا کہ پرم آتما کے پیش
اُس کا سر تمام تخلیقی بونوں سے اونچا ہوتا
لیکن وہ تو میری نصف خواہش کا بھی جزر نکلی ہے!

اگر مجھے علم ہوتا
کہ عورت اور محبت میں آدھے دکھ کا فرق ہے
تو میں آخری نظم مکمل ہونے سے پہلے
اتنا بے نم اور تہی لفظ نہ ہو جاتا
اب میرے پاس رونے اور لکھنے کے لیے
کچھ بھی نہیں بچا......!!

قامت

بانس کی ٹانگوں پر
بونا بھی اونچا نظر آتا ہے
حالانکہ اونچا ہونے کے لیے
ٹانگیں نہیں
سر ضروری ہے!

ایک تار کا رابطہ

ترسیل کے لیے
دو تاروں کی ضرورت ہوتی ہے
ٹیلی گرافی ہو یا ٹیلی پیتھی
دوستی ہو یا محبت
شعر و شاعری ہو یا خط و کتابت
گفتگو ہو یا خاموشی
دو طرفہ ہوتی ہے
دو دلوں، دو ذہنوں کی فریکوئنسی مل جائے
تو جذبوں کو زبان مل جاتی ہے
اداسیاں ڈی کوڈ ہونے لگتی ہیں

ایک سوچتا ہے
دوسرا محسوس کرتا ہے
ایک بولتا ہے
دوسرا سنتا ہے
ایک لکھتا ہے
دوسرا پڑھتا ہے
ایک emit کرتا ہے
دوسرا ریسیو کرتا ہے
لیکن ایک تار کے رابطے میں
کچھ بھی صاف سنائی نہیں دیتا
شُوں شُوں، ٹُوں ٹُوں
لایعنی آوازوں کا شور......

ہمارے درمیان بھی
اب ایک تار کا رابطہ رہ گیا ہے
سارے الفاظ، ساری باتیں یک طرفہ ہیں
کیا خبر کس وقت
یہ ایک تار کا رابطہ بھی ٹوٹ جائے
اور پھر گمبیھر خاموشی
دونوں سروں پر......

عظیم روحیں معمولی جسموں میں رہتی ہیں

چیزوں کو
کسی بھی سمت،
کسی بھی زاویے سے دیکھیں
وہ اپنی ہیئت اور ماہیت سے
باہر دکھائی نہیں دیتیں
البتہ
لوگوں کی بات اور ہے
ایک طرف سے عظیم الجثہ دکھائی دینے والے
کسی دوسرے رُخ سے
کوتاہ نظر آتے ہیں

اور بعض اوقات
معمولی جسموں کے بھیتر
عظیم روحوں کے ٹھکانے ہوتے ہیں!

دنیا چالاک لوگوں کے لیے بنی ہے

بچے معصومیت سے پوچھتے ہیں
مرنے کے بعد
جانوروں کی روحیں کہاں جاتی ہیں
کیا مچھلی کی روح
سمندر سے چلی جاتی ہے
اور پرندے
درختوں کی شاخوں کا روپ دھار لیتے ہیں؟
بچے خیال ساز تو ہوتے ہیں
نظریہ کار نہیں
وہ ارتقا اور تناسخ کا فلسفہ بھی نہیں سمجھتے

وہ نہیں جانتے
کون کس جنم میں کیا تھا اور کیا ہوگا
انھیں کیا معلوم
کہ دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے
جن کی خوراک
معصوم روحیں ہوتی ہیں
وہ جانوروں کی ہوں یا انسانوں کی!!

لا کلامی میں کلام

تم نہیں دیکھ سکتے
لیکن میں دیکھ سکتا ہوں
نیند کا سایہ
اور دھوپ کی پرچھائیں
اور قدیم پتھروں
اور درختوں کی چھالوں سے
برآمد ہوتی روحیں
اور سُن سکتا ہوں
ہوا کی سرگوشیاں
اور دروازے کھلنے کی آواز

ور آ جا سکتا ہوں
اُن راستوں پر
جو تمہارے وجود کے اٹلس میں
کہیں دکھائی نہیں دیتے
تم نہیں جانتے
لیکن میں جانتا ہوں
کہ جب کسی گم گشتہ خواب کے سناٹوں میں
تنہا راستوں سے
گزرنے کا وقت قریب ہو
تو عتیقی صداؤں کی
بے آواز لے تیز ہو جاتی ہے!

گفٹ پیپر میں لپٹی چیزیں

میں سمجھتا تھا
کہ دنیا تمہارے بغیر
کتنی چھوٹی سی ہے
تمہاری پروان چڑھتی زندگیوں کے درمیان
مجھے معلوم نہ تھا
کہ میں پانی کی طرح بہہ رہا ہوں
اور مٹی کی طرح اُڑ رہا ہوں
اور کتنا زندہ ہوں
اور کتنا مر چکا ہوں
تم نے نہیں دیکھا

کہ سب کس کس طرح مجھ کو دیکھتے تھے
اور جانتے تھے
کہ میں یکتائی کی جنگ جیت نہیں سکتا
کیونکہ شاعری اور تم ایک ساتھ
میرے گوشت اور میری ہڈیوں کے گودے میں رچے بسے تھے
تم نے کبھی ان راستوں پر قدم نہیں رکھے
جن پر چلتے ہوئے
میرے پاؤں گِھس گئے
اور میں صفر اعشاریہ صفر ایک ملی میٹر سے
قامت کا مقابلہ ہار گیا
تم نے وہ آنسو بھی نہیں دیکھے
جو میری آنکھوں میں اُمنڈنے کے باوجود
تیزی سے یُوٹرن لے کر
دل کے اندر کی مٹی میں جذب ہوتے رہے
یہاں تک کہ اب وہاں
سیّال دھاتوں اور گاڑھی کیچڑ کی دلدل نے
خون کی نالیوں کا راستہ روک لیا ہے
اپنی اپنی نیندوں کی آسودگیوں میں
تم نے خوابوں کی اُن درزوں کو نہیں دیکھا
جن سے گزرتے ہوئے

میرے جسم کی کھال اُتر گئی
اور میری لہو ٹپکاتی ہوئی برہنہ پرچھائیں
بے وجودی کی تصویر بن گئی
اب میں زندگی کے کسی البم میں نظر نہیں آتا
اور گفٹ پیپر میں لپٹی چیزوں کی طرح
ایک کونے میں پڑا سب کو دیکھتا رہتا ہوں!

نظمیہ

دن اور رات کے سنگم پر
ایک شفق رنگ دریا پڑتا ہے
جسے عبور کرنے کے لیے
تنکے کا خواب ضروری ہے!

کہانی جو کبھی ختم نہیں ہو گی

کہانی کار!
تم ایک سایہ ہو
جو کبھی نہیں ڈھلتا
ایک بادل کی طرح ہو
جو برس کر پھر بارش بن جاتا ہے
دلوں کے دروازوں پر
حزینہ آرکسٹرا کے ساتھ بجنے والی
ایک مسلسل دستک ہو
اور آنکھوں کی کھڑکیوں میں بھرا ہوا منظر ہو
جو کبھی معدوم نہیں ہوتا

موت نے تمہیں چُھوا ضرور ہے
لیکن چکھا نہیں
چکھ ہی نہیں سکتی
وہ تو اتنی کورذائقہ ہے
کہ صرف جسموں کو کھاتی ہے
وہ تم جیسی خوبصورت روحوں کی چاٹ سے ناآشنا ہے
تم وہ ذائقہ ہو
جسے صرف لفظوں نے چکھا ہے
اور کاغذوں نے محسوس کیا ہے
ہم، کتابی کیڑے
زندگی بھر تمہیں پڑھتے رہیں گے!!

(منشا یاد کی یاد میں)

کہاں تک میرا پیچھا کرو گے!

دوست کلیشے!
ایک سے لے کر سبع تک
گنتی پوری ہو چکی ہے
اور کسی نئے عدد کی
جنم کو یتا تمہارے کرم بھوگ میں نہیں
آخری بار تم نے مجھے
لاعلمی کی دشا سے ڈھونڈ نکالا تھا
اور خوش تھے
کہ تمہاری نظم مکمل ہو گئی ہے
ایک، دو، تین سے سات تک کی

بہت تکرار کر چکے
اب آٹھ سے دس تک گنو
یہاں تک کہ سارے اعداد کلیشے بن جائیں
شاید کوئی شبھ ریکھا
تمہارے ہاتھ لگ جائے
اور تمہارے پاؤں
کسی کے نقشِ پا میں سما جائیں
لیکن تب تک میں
تمہارے روز و شب کی جگالی سے باہر
ہندسوں، حرفوں اور تقویموں سے آگے
کائنات کی ان گنت دشاؤں میں
پھیل چکا ہوں گا
تم کہاں تک میرا پیچھا کرو گے......؟

جھیل

یہاں سے نظر آتی ہے
کبھی صاف کبھی دھندلی
دیکھتا ہوں روزانہ
صبح اٹھ کر
ٹیرس پر چہل قدمی کرتے ہوئے
کووں کے غول
اڑ کر شہر کی طرف آتے ہیں
اور وہ پھیل کر
کرائے کے اس مکان تک آ جاتی ہے
جہاں میں مقیم ہوں

اور بھینچ لیتی ہے مجھے اپنی وسعت میں
کسمسانے لگتا ہوں میں کسی بچے کی طرح
رفتہ رفتہ
مَیں نے پانیوں پر چلنا سیکھ لیا ہے
مَیں جب
اس کے پیٹ اور سینے پر
اپنے کھردرے پاؤں رکھتا ہوں
تو اسے گدگدی ہوتی ہے
تھرتھرانے لگتا ہے اس کا پانی
اور کھلکھلانے لگتی ہے اس کی خاموشی
اور اب تو
مجھے اپنی تہہ میں
آبی جانوروں کی سرسراہٹ بھی محسوس ہونے لگی ہے
یوں لگتا ہے جیسے
میں خود جھیل بن گیا ہوں!

دریا کا پھیر کس نے پایا ہے!

دریا بہتا رہے گا
تم اس کے کنارے
بیٹھو یا نہ بیٹھو
اس کے پانیوں میں اُترو یا نہ اُترو
اسے پار کرو یا نہ کرو
جسم کی ناؤ اس میں
اتارو یا نہ اتارو
دریا بہتا رہے گا
اس کے آگے بند باندھ کر
جھیل بناؤ

یا مٹی کے پشتوں سے
اس کا راستہ روکو،
یہ پھر چل پڑے گا
پرندوں اور مچھلیوں کی جلو میں
کھیتوں اور میدانوں سے ہوتا ہوا
ایک ابدی بہاؤ کی جانب
ندیاں اور نالے
پھر اس میں آن ملیں گے
دریا بہتا رہے گا
اپنی رَو میں، روانیوں میں
ملاحوں کے گیتوں میں، بانیوں میں
شاعری میں
اور کہانیوں میں............!!

پرندوں کے خواب

پرندے خواب دیکھتے ہیں
کہ زمین پر غلے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں
قفس ٹوٹے پڑے ہیں
اور مکانوں کی جگہ گھونسلے بن گئے ہیں!

پرندے خواب دیکھتے ہیں
کہ پہاڑ پھر سے
اپنا قدیم آسن جمائے بیٹھے ہیں
زمین کھیتوں اور جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ہے
جھیلیں شفاف پانیوں سے بھر چکی ہیں

اور درخت
پھولوں اور پھلوں سے لد گئے ہیں!

پرندے خواب دیکھتے ہیں
کہ سمندروں کی لہریں
پُرسکون ساحلوں کو نغمۂ تر سنا رہی ہیں
جزیروں پر دھوپ پاؤں پھیلائے
نیم برہنہ لیٹی ہوئی ہے
آسمان صاف اور نیلا ہے
اور بستیاں انسانوں سے خالی ہو چکی ہیں!

بیاضِ وقت کا اگلا ورق خالی ہے

تم کن موسموں کے انتظار میں
ہونٹوں پر خشک سالی
اور آنکھوں میں بارشیں سنبھالے ہوئے ہو؟
تمہارے حصے کے آسمان کو
بدبودار سانسیں دھندلا کر رہی ہیں
بادل، ہوا اور آبی بخارات ذخیرہ کرنے کی
اجازت ان کو ہے
جن کے تصرف میں دوسروں کے حصے کی زمینیں ہیں
تمہارے پاس تو چلنے کے لیے پاؤں بھر راستہ بھی نہیں
کارخانوں میں دھوپ

اتنی وافر مقدار میں تیار ہوتی ہے
کہ تمہاری رات
نوکِ قلم سے ٹپکی ہوئی سیاہی کے
ایک نقطے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی
زائر، کانگو اور روانڈا میں
ہزاروں لاکھوں کالے انسان مرنے سے
کیا زمین پر دھبوں اور پرچھائیوں کا
قحط پڑ گیا ہے؟
جہاں پیدا ہونے پر طبلک
اور مرنے پر ماتمی دھنیں بجائی جاتی ہوں
وہاں زندگی اور موت کے درمیان
تم کون سی نئی سمفنی ترتیب دینا چاہتے ہو؟
ہزاروں سال پہلے کا
بے شعور انسان
ہڈیوں سے بانسری بنانے
اور سُر کی نَے پر
انگلیاں بجانے کا فن جانتا تھا
اور تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم
کہ سورج، چاند اور سیارے
نادیدہ کہکشائیں، بلیک ہولز، دُم دار ستارے

خلائی رصد گاہیں
ارضی شہر اور بستیاں
تمہارے وقت کی دسترس سے دُور
ایک ایسی صدی میں داخل ہونے والی ہیں
جہاں لیزر کی شعاعیں
تمام روشنیوں پر غالب آ جائیں گی
اور تمہارے انتظار کا دورانیہ
ختم ہونے تک
کائنات کی بیاض سے
گیت اور الفاظ تحلیل ہو جائیں گے!!

کبوتروں کے پاس کوئی خواب نہیں

وہ محض امن کی علامت ہیں
اور ڈربوں کی قید میں
بلی کے خوف سے
آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں!

غت رَبود

یہ موت کے دن ہیں
یا زندگی کے
کچھ پتہ نہیں چلتا
افراطِ مرگ و زیست میں
سب کچھ اتنا عام ہو گیا ہے
کہ سیاہ و سفید میں
تفریق کرنا مشکل ہے
رات کے ساحل پر
روشنیوں کا پلازما لہراتا ہے
اور دن کا دریا

بغیر بجلی اور پانی کے
ٹھاٹھیں مارتا ہے
پگڈنڈیاں
شاہراہوں میں بدل گئی ہیں
اور ڈھوکیں
شہروں میں مدغم ہوکر
آبادی کا ملغوبہ بن چکی ہیں
دولت کی پھولاہٹ
اور مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ میں
فتورِ ہضم کا مارا
خورونوش کا عادی
فاسٹ فوڈ کا دلدادہ ہجوم
یک سار ڈکارتا ہے
محبت، جذبوں کی
نیل گوں تھاہ سے نکل کر
لفظوں کے اتھلے پن میں شپ شپاتی ہے
عمروں کی مسافت طے کرنے کے لیے
کہیں جانے کی ضرورت نہیں
ساری منزلیں ایک بٹن کی دُوری پر ہیں
فاصلے ایک چھوٹی سی اسکرین میں سمٹ آتے ہیں

اور راستے
جوگنگ مشین پر
چلے بغیر ختم ہو جاتے ہیں......!!

اندھیرے کی آنکھ

اندھیرا
اندھیرے ہی میں نظر آتا ہے
اسے دیکھنے کے لیے
ست رنگی روشنی کی ٹارچ
کام نہیں آتی!

نیند میں جاگتے رہنا ضروری ہے!

ایک خواب
ہر شب میری نیند میں داخل ہو جاتا ہے
کسی خفیہ راستے سے
میرے وجود کا خود کار حفاظتی نظام
اُسے ٹریس نہیں کر پاتا
آنکھ کھلنے پر بھی
کچھ پتہ نہیں چلتا
کہ وہ اپنی نامعلوم کارروائی مکمل کر کے جا چکا ہے
یا اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہے
مجھے تو وہ خواب

حالیہ ترقی یافتہ زمانے کا تربیت یافتہ لگتا ہے
جسے فردا کو اغوا کرنے کا
خصوصی مشن سونپا گیا ہے
یا کسی عہدِ عتیق کی
ہڈیوں سے نکلی ہوئی جینیاتی سازش کا حصہ
جسے خلیوں میں چھپی
اوّلین سچائیوں کے کوڈز معلوم ہیں
اور وہ انھیں چپکے چپکے
دوسری دنیاؤں کے ذی ارواح میں منتقل کرنا چاہتا ہے
جہاں ان کی مدد سے
سدا بیدار اعلیٰ تعبیراتی کلونز بنائے جائیں گے
اور خوابوں میں آمد و رفت کے راستے
ہر خلائی مخلوق کو از بر کرائے جائیں گے
اس خواب کاری سے بچنے کے لیے
میں دن رات جاگنے کی مشق کر رہا ہوں
اور دائمی نیند کی تیاری بھی
مجھے کسی بھی طرح اس خواب کو
آنکھ بدر کرنا ہے
یا نیند مقابلے میں ہلاک کرنا ہے
ورنہ وہ شب خیزیا،

نوعِ انسان و بنی جان کی نیندیں اچٹانے
اور راتیں اجاڑنے میں کامیاب ہو جائے گا
اور رت جگے
سوئے ہوئے بچوں کی معصومیت سمیت
پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے!

چڑیا کی دُم

گھومتی ہے جب
تو کتنی خوبصورت لگتی ہے
اسے دیکھتے ہوئے
میں کئی ضروری کام بھول جاتا ہوں
یہاں تک کہ نظم لکھنا بھی......!

خوابوں کی افادیت

نیند میں
خواب دیکھتے ہوئے
کچھ بھی کیا جا سکتا ہے
مثلاً گدھے کی سواری
شیر کے ساتھ دوستی
پالتو میمل کے تھنوں سے راست دودھ پینا
چیونٹیوں کے بل میں گھس کر
اُن کی جمع کی ہوئی خوراک چوری کر لانا
درخت کی چوٹی پر بیٹھ کر قیلولہ کرنا
مَرے بغیر اپنی قبر میں جا کر لیٹ جانا

نماز پڑھتے پڑھتے سو جانا
ساتھ لِٹائے ہوئے کھلونوں کو
بچوں کی طرح ٹانگ مار کر
بیڈ سے نیچے گرا دینا
صدرِ مملکت کے پیٹ میں گدگدی کرنا
اور وزیرِاعظم کے ساتھ گپیں لگاتے ہوئے
ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے لگانا
اور وہ سب کچھ
جو بیداری کی حالت میں
عام طور پر نہیں کیا جا سکتا!

تھنک ٹینک

وہ سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں
اور حل سوچتے ہیں
دنیا میں
خود پیدا کردہ مسائل کا!

نظمیہ

بچے کائنات کی عمر
اپنی زندگی سے
اور اپنی عمر
جنم دن سے شمار کرتے ہیں!

سمندر کو ڈوبنے سے بچالیا گیا ہے

بچالیا گیا ہے!
بچالیا گیا ہے!
توپ کے دہان سے باتوں کے گولے نکلے
رات کی شاخوں سے اُلو اُڑے
چاند کے چہرے پر سیاہی مَلنے والے
بھاگ کر
قریبی لینڈ اسکیپ میں چُھپ گئے
سویا ہوا دن یک دم جاگ اٹھا
اور دیکھتے ہی دیکھتے
گوشت پوست کے بنے ہوئے زندہ خواب

راکھ کے سلیٹی ڈھیر میں تبدیل ہو گئے
سورج معاملے کی تہہ تک پہنچے بغیر
چَماچَم چمکنے لگا
نہ جانے کہاں سے امنڈ آنے والا
آوازوں کا ایک جلوس
پیلے پھولوں سے ڈھکی ہوئی
شاہ راہِ املتاس پر
ہریالی کے نعرے لگاتا
ایوانِ اعظم کے صدر دروازے تک پہنچ کر
رک گیا (یا روک دیا گیا)
ساکت وصامت
اس دوران میں سورج عین سروں پر آ گیا
اور درختوں اور انسانوں کے سائے پگھلنے لگے
آوازوں کا بے جنبش ہجوم
آنسو گیس کے ایک ہی شیل سے
بخارات میں تبدیل ہو کر بکھر گیا
رئیسِ اعظم نے کھڑکی کے شیشے سے پردہ سرکایا
اور فخر سے بھاپ ہوتی ہوئی آوازوں کو دیکھا
جلدی جلدی کچھ احکامات جاری کیے
اور عمارت کے محفوظ ترین حصے میں چلا گیا

سورج جو اپنی اکلوتی تاب کار آنکھ سے
یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا
خاموشی سے ایک طرف کھسکنے لگا
یہاں تک کہ افق کا کنارہ آ گیا
اور شام دکھائی دینے لگی
عوام کے حصے کی زمین پر
لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اندھیرا تھا
لیکن ریڈ زون
اور جمہوری مساوات کے مخصوص علاقوں میں
اتنی روشنیاں تھیں
کہ عمارتوں اور ان میں رہنے والوں کی
پرچھائیاں بھی نظر نہیں آتی تھیں
غیر ملکی مہمانوں کے عشائیے میں
ایک بھی زندہ انسان نہیں تھا
سب اشاروں پر چلنے اور بولنے والے
مراعات یافتہ ڈمی تھے
رئیسِ اعظم نے
دستانوں میں چھپائے ہوئے آہنی ہاتھ اٹھائے
بہ یک زبان ایک نعرہ بلند ہوا
بچا لیا گیا ہے

بچا لیا گیا ہے
سمندر کو ڈوبنے سے بچا لیا گیا ہے
اور پھر سب کے سب
نقرئی چھریوں اور کانٹوں کے ساتھ
بُھنے ہوئے خوابوں
اور خوشحالی کے تازہ کبابوں پر
ٹوٹ پڑے
حسبِ معمول
اگلے دن کے اخبارات
حکومتی کارناموں سے بھرے ہوئے تھے
جلے ہوئے خوابوں
اور ڈوبنے والوں کا
کہیں ذکر نہ تھا......!!

فیصلہ لکھا جا رہا ہے

تم فیصلے کی زبان نہیں سمجھ سکتے
نہ اس کا ترجمہ
اپنی مادری
یا من پسند
یا کسی بین الاقوامی زبان میں کروا سکتے ہو

فیصلہ لکھا جا رہا ہے
ان دیکھے گواہوں کے
بے لفظ بیانات،
نظر نہ آنے والے واقعات

اور گم نام صحافیوں کی بھجوائی گئی
نادیدہ ویڈیوز کی بنیاد پر

تم جانتے ہو
کہ فیصلہ تمہارے حق میں نہیں
لیکن پڑھنے سے قاصر ہو
تم نے تو نوشتۂ دیوار بھی نہیں پڑھا
اعلیٰ تعلیمی اسناد رکھنے کے باوجود
کبھی اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی
اور سُن بھی نہیں سکتے
کیونکہ تمہاری سماعت
صرف اپنی مرضی کی زبان سننے کی عادی ہے

اب تم صرف دیکھ سکتے ہو
وقت کو اپنے ہاتھ سے گرتے ہوئے
اور منصف کے قلم کو چلتے ہوئے
فیصلہ لکھا جا رہا ہے
خاموشی کی زبان میں......!

اب ہم رات ہو چکے ہیں

جب ہم دن تھے
تو کتنے روشن تھے
ہمارے اردگرد ٹھنڈے ٹھار سایوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی
دھوپ ہماری کھڑکیوں سے
سارا دن اندر جھانکتی تھی
اور شام سرمئی ہو کر بھی
تا دیر نارنجی رہتی تھی
اور رات بھی رات کب ہوتی تھی
چاندنی میں نہائی ہوئی
تاروں سے سجی ہوئی

الو ہی خوابوں کی بشارت دیتی ہوئی
دیوی کی طرح ہوتی تھی
جو صبح تک ہمیں بے آواز لوریاں دیتی تھی
اور ہم زمین پر سوتے ہوئے بھی
ایک آسمانی نیند میں کھوئے رہتے تھے
اور شفاف ترین روحوں کے ساتھ
اگلے دن کا آغاز کرتے تھے

اب ہم رات ہو چکے ہیں
سرتاپا
بدرَو کے پانی جیسی چپ چپاتی گاڑھی سیہ رات
سورج ہماری بالکونیوں میں جھانکنے کی زحمت نہیں کرتا
اور ہمیں بھی دھوپ
بدن اور روح کی تمازت کے لیے نہیں
صرف سولر انرجی کے لیے درکار ہے
چاند اور تارے ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتے
دن ہو یا رات کوئی فرق نہیں پڑتا
ایک مادر زاد برہنگی ہمارا لباس ہے
اور منافقت کی چادر ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے
نام نہاد جمہوریت کے نام پر

ہم، الیکشن میں
ایسے لوگوں کو منتخب کرتے ہیں
جن کے ظاہر تاریک
اور باطن تاریک تر ہیں
روشنی اب ہمیں راستہ نہیں دکھاتی
بلکہ ہماری تیرہ بختیوں کو نمایاں کرتی ہے
اور ہماری
رُوسیاہیوں کا پردہ چاک کرتی ہے
اب ہم دن نہیں رہے
دن کے نام پر گالی بن چکے ہیں!

بچوں کے نگران فرشتے کا خواب

سب پُورے ہیں
ایک بھی کم نہیں
جتنے صبح تھے
اتنے ہی شام کو ہیں
کیونکہ آج
غزہ پر بمباری
ساؤتھ اور نارتھ وزیرستان میں
ڈرون حملہ
اور امریکہ کے کسی اسکول میں
فائرنگ کا کوئی واقعہ نہیں ہُوا......!

فوزان

فوزان
اتنے شوق سے
چیونٹی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے
کہ جیسے یہ اُس کے لیے
کوئی آسمانی مخلوق ہو
تتلی کو یوں حیرت سے دیکھتا ہے
جیسے وہ کوئی اُڑن طشتری ہو
رنگین پروں والی چڑیا کا گھونسلا
اُس کی دیکھی ہوئی دنیا کا
سب سے بڑا عجوبہ ہے

چڑیا نے یہ گھونسلا چند ہی روز ہوئے بنایا تھا
اور اس میں دو خوبصورت چترے انڈے دیے تھے
جنھیں شاید کوّے ہڑپ کر گئے
یا شاید سانپ نے نگل لیا
چڑیوں کا جوڑا
سارا دن دیوار پر بیٹھا
اپنی بے حاصل محبت کا سوگ مناتا رہا
پھر نہ جانے کہاں چلا گیا
انسانوں کے معاشرے کا بھی یہی قانون ہے
طاقتور کمزور کو کھا جاتا ہے
حکمران عوام کا خون چوس لیتے ہیں
لیکن فوزان ابھی چھوٹا ہے
اسے فطرت اور سیاست کے
اِس ظالمانہ اشتراک کے بارے میں کچھ پتہ نہیں
وہ تو اپنی معصوم شرارت بھری ترنگ میں
پھولوں کی پتیاں بکھیر کر
میری طرف دیکھتے ہوئے یوں مسکرا رہا ہے
جیسے اسے میری بے بس اداسی کا علم ہو گیا ہو
بچے کی اپنی ٹیلی پیتھی ہوتی ہے
لان میں بھاگتے ہوئے

ایک پَل میں وہ
کائنات کے اَن گنت گوشوں کو ہاتھ لگا آتا ہے
اور میں اپنی بند ہوتی ہوئی شریانوں
اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ
وہیں کھڑا اس کو دیکھتا رہتا ہوں
اس کی بے ساختہ ہنسی کی بارش میں
گھاس اور بھی سبز، دھوپ اور بھی سنہری ہو جاتی ہے
ٹَف ٹائلز کے فٹ پاتھ پر
میری انگلی پکڑ کر چلتے ہوئے
زِگ زیگ بناتی ہوئی
اس کے ننھے قدموں کی آواز
باتونی ہوا کی سَرسَر میں بھی
صاف سنائی اور دکھائی دیتی ہے
آواز کو چلتے ہوئے
میں نے کئی بار سنا تھا
لیکن دیکھنے کا تجربہ فوزان کے ساتھ واک کے دوران ہوا
ظرفاب کے بالکل ساتھ منہ چِپکا کر
وہ جب آرائشی مچھلیوں کو کِس کرتا ہے
تو اس کے پھول جیسے ہونٹوں کا لمس
شیشے کی دیوار پر

سمندر کی طرح لہرانے لگتا ہے
اور کمرہ جل پریوں سے بھر جاتا ہے
ابھی چھوٹا ہے
ٹھیک طرح سے بول بھی نہیں سکتا
لیکن کس آسانی سے میں اس کے ساتھ شیئر کر سکتا ہوں
اپنی خرد سالہ مہان تا اور عمومیت کی سرخوشی
جیسے وہ ابھی سے جاننے لگا ہو
کہ میں بولتے بولتے چپ کیوں ہو جاتا ہوں
اُسے نہیں معلوم
دنیا معمولی پن سے خالی ہوتی جا رہی ہے
مائکرو سے میکرو کی جانب رواں
ہر چیز کلاں
اور ہر کوئی عظیم ہونا چاہتا ہے
اِس مہا کلپ میں
عالمِ صغیر کی خوبصورتیاں گہنا گئی ہیں
فوزان، میرا نواسا، ابھی چھوٹا ہے
صرف دو سال کا
سوچتا ہوں
ایک دن وہ بھی بڑا ہو جائے گا
میری سال خوردہ تنہائی کی طرح......!

انتم سمے کی بات

یہ اُس سمے کی بات ہے
جب میں نے اپنے لیے ابدی نیند چُنی تھی
اور تمہارے لیے خواب کھڑکی پر سجا دیئے تھے
تا کہ تم دیکھ سکو
باہر سے بھی
اور اندر سے بھی
مگر تم واش روم میں اتنا وقت لگا دیتے ہو
کہ اس دوران آدھی زندگی بیت جاتی ہے
مجھے یہ فکر ہے
کہ تم آدھی عمر کے ساتھ

کائناتی بلوغت تک کیسے پہنچو گے
بے شک جنت ماں کے قدموں تلے ہے
لیکن دانش باپ کی پشت پر سوار ہو کر آتی ہے
وقت ہر آن شکلیں بدلتا ہے
دیکھتے ہی دیکھتے
چہرے اور آنکھیں
رشتے اور باتیں
یہاں تک کہ عظیم محبتیں
اور عظیم جنگیں
تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں
تم نے تو ابھی صرف
جنم دن کے بادامی اور چاکلیٹی کیک کاٹے ہیں
آبائی راستوں کے سفر میں
طویل اور بے ستارہ راتیں نہیں کاٹیں
موت کے دنوں سے
ابھی تمہارا پالا نہیں پڑا
جب آدمی پل پل مرتا ہے
جینا اگر اتنا آسان ہوتا
تو میں عمر بھر جیتا
اور اتنی نظمیں لکھتا

کہ دنیا لفظوں سے بھر جاتی
مرنے سے پہلے مرنے کا فن ہر کسی کو نہیں آتا
تم میری موت کا دن بھول بھی جاؤ گے
تو زمانہ یاد رکھے گا
کیونکہ میں نے اپنے لیے ابدی نیند چُنی ہے
اور تمہارے لیے خواب......!

(سمیر کے لیے)

نظمیہ

شاعر نظم لکھتے لکھتے
آخری سطروں میں
اپنے آپ سے روٹھ جاتا ہے
اور نظم ادھوری رہ جاتی ہے!

نصیر احمد ناصر کی دیگر کتابیں

عراںچی سو گیا ہے	نظمیں
پانی میں گم خواب	نظمیں
ملبے سے ملی چیزیں	نظمیں
زرد پتوں کی شال	ہائیکو
ظرفاب	غزلیں
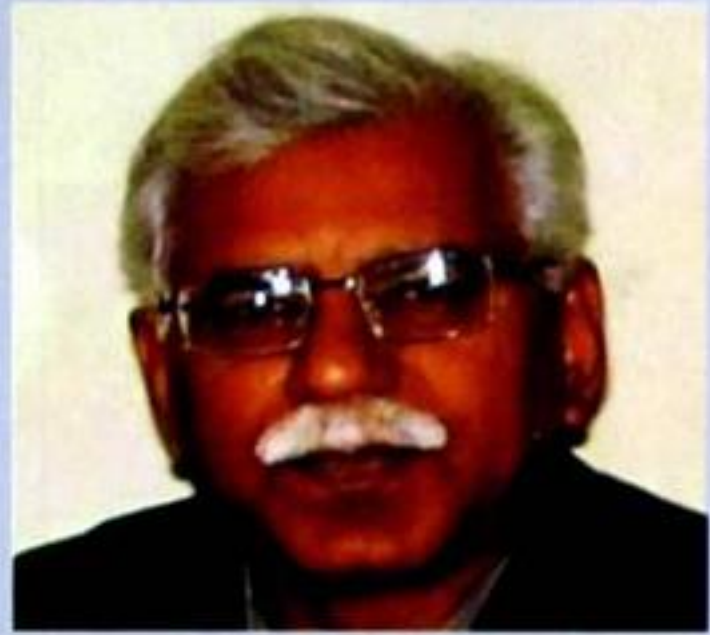
نصیر احمد ناصر جدید اردو نظم کے انتہائی معتبر، صاحبِ اسلوب، رجحان ساز اور بین الاقوامی پہچان اور اہمیت کے حامل شاعر ہیں، جن کی نظمیں انگریزی، روسی، ہسپانوی، ازبک، رومانین، فارسی، ہندی اور دیگر کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ کم و بیش چار دہائیوں پر محیط نصیر احمد ناصر کی ادبی زندگی کسی بھی قسم کی منفی ادبی سماجیات، ستائشی تقریبات اور رونمائیوں سے بے نیاز حقیقی معنوں میں تخلیقی سچائی کی آئینہ دار ہے۔ نصیر احمد ناصر کی نظموں میں نہ صرف روحِ عصرِ رواں ہے بلکہ ان میں کئی صدیاں سانس لیتی ہیں۔

نصیر احمد ناصر اپریل 1954ء میں ضلع گجرات کے ایک دُور افتادہ گاؤں ناگڑیاں میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ زندگی کا طویل عرصہ کھاریاں میں گزارا اور گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں اور سی۔ بی ڈگری کالج کھاریاں کینٹ میں زیرِ تعلیم رہے۔ کچھ عرصہ ملک سے باہر اور میرپور آزاد کشمیر میں بھی رہے۔ اب مستقل طور پر راولپنڈی میں رہائش پذیر ہیں۔

ISBN: 978-969-593-083-0

سانجھ
SANJH PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com